سمندر دور ہے

کرشن چندر

نو ہند پبلشرز لمیٹڈ

بہرام جی منشن ۔ فیروز شاہ مہتا روڈ ۔ فورٹ بمبئی

بار اوّل — دسمبر ۱۹۴۸ء

قیمت

دو روپے بارہ آنے

بیجناتھ ناشر نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے چھپوا کر نو ہند پبلشرز لیمٹڈ۔ برام جی منشن فیروز شاہ مہتا روڈ فورٹ بمبئی سے شائع کیا

۵

سپاہی

زمان خان اور شہباز خان ایک ہی پلٹن کے سپاہی تھے، ہمراز اور دوست، یہ دوستی کافی گھروں، شراب خانوں اور رقص گاہوں کی دوستی نہ تھی، یہ دوستی طیاروں کی اڑانوں، بم کے دھماکوں اور موت کے پھیلتے ہوئے سایوں میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس میں نفاست، نسائیت، ملائمت نام کو نہ تھی بڑی اکھڑ، وحشی، ظالم۔ کھردری دوستی تھی یہ۔ اس دوستی کی بنیاد جھنڈ کے بوٹوں کی جڑوں کی طرح مضبوط تھی۔ اور اس کی استواری میں علاقہ پوٹھوہار کی سطح مرتفع کی سی سختی پائی جاتی تھی۔ اس دوستی میں رونا دھونا نہیں ہوتا۔ گلے شکوے نہیں ہوتے شعر و شاعری نہیں ہوتی۔ بلکہ اک ایسی حیرت انگیز سوجھ بوجھ ہوتی ہے جو ہمیشہ

۵

سپاہی

زمان خان اور شہباز خان ایک ہی پلٹن کے سپاہی تھے، ہمراز اور دوست، یہ دوستی کافی گھروں، شراب خانوں اور رقص گاہوں کی دوستی نہ تھی، یہ دوستی طیاروں کی اڑانوں، بم کے دھماکوں اور موت کے پھیلتے ہوئے سایوں میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس میں نفاست، نسائیت، ملائمت نام کو نہ تھی بڑی اکھڑ، وحشی، ظالم۔ کھردری دوستی تھی یہ۔ اس دوستی کی بنیاد جھنڈ کے بوٹوں کی جڑوں کی طرح مضبوط تھی۔ اور اس کی استواری میں علاقہ پوٹھوہار کی سطح مرتفع کی سی سختی پائی جاتی تھی۔ اس دوستی میں رونا دھونا نہیں ہوتا۔ گلے شکوے نہیں ہوتے شعر و شاعری نہیں ہوتی۔ بلکہ اک ایسی حیرت انگیز سوجھ بوجھ ہوتی ہے جو ہمیشہ

پلکوں تلے ڈھلکی رہتی ہے۔ اک ایسی گہری رفاقت ہوتی ہے جو کبھی دل سے باہر نکل کر زبان پر نہیں آتی، اک ایسی نرم و نازک خوبصورتی ہوتی ہے، جس پر ہمیشہ غلیظ گالیوں کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔ زمان خان اور شہباز خان اکثر ایک دوسرے کی گالیوں سے تواضع کرتے۔ لڑتے جھگڑتے رہتے۔ ایک دوسرے کے خلاف چھوٹی موٹی شکائتیں بھی اپنے حوالدار سے کر دیا کرتے لیکن ہر مصیبت کے وقت اور ہر خطرناک کام میں، اور ہر نازک مقام پر وہ دونوں یک جا ہو جاتے پلٹن کے افسروں اور سپاہیوں کو اس کا اچھی طرح احساس تھا۔ اور یوں ہی شرارت میں کئی بار ان لوگوں نے ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن انھیں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔

اور اب جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اور پانچ سال کی طویل غیر حاضری کے بعد یہ دونوں سپاہی اپنے وطن لوٹے تھے۔ اور اس وقت گاڑی میں بیٹھ کے اپنے گھر جا رہے تھے۔ شہباز چاک لالے کا رہنے والا تھا۔ اور زمان خان جہلم کا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اور گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر پوٹھوہار کی گرتی ابھرتی، پھیلتی، گھومتی سطح مرتفع کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کیکر کے درخت تھے سرین اور ببول، جنڈ کی جھاڑیاں۔ اونچی چٹانیں اور سرخی مائل بھوری زمین جس میں باجرے کے سوا اور کچھ پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ یہ زمین جو باجرا پیدا کرتی ہے۔ اور فولاد کی طرح مضبوط انسان پیدا کرتی ہے۔

گاڑی، اونچی چٹانوں کے اک لمبے سلسلے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی گاڑی کے دونوں طرف اک گرتی ہوئی وادی تھی۔ گاڑی کے ساتھ اور ذرا اوپر

پہاڑی پر ایک پتلی سی پگڈنڈی ایک نوجوان لڑکی کے قدموں سے لپٹی چلی جا رہی تھی۔ لڑکی کے سر پر مٹکی تھی۔ اور اس کی چال میں ڈھولک کی تال تھی۔ "ماہیا الڑے ماہیا الڑے۔ چن شپا ماہیا الڑے"، شہباز آہستہ سے گنگنانے لگا۔ پھر کسی خیال کے زیر اثر فوراً رک گیا۔ اور اس کے پتلے ہونٹ اندر بھینچ گئے۔ اور اس نے آہستہ سے کہا: "وہ دور پار عبداللہ کا گاؤں ہے"

گھاٹی کے نیچے وادی، وادی کے بیچ میں ندی۔ اور ندی کے پار گاؤں اور گاؤں کی حد کے اوپر پھیلا ہوا آسمان، یہ عبداللہ کا گاؤں تھا۔ لیکن عبداللہ واپس نہ آیا تھا۔ وہ ایک اطالوی گاؤں میں دشمن سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا، اور اس کا جسم اجنبی زمین کے سینے میں دفن تھا۔

زمان خان نے کہا: "اور نثار بھی"،

شہباز بولا: "اور کرم داد"،

زمان خان نے کہا: "بھٹی"

چہروں کی ایک لمبی قطار ان کی نگاہوں سے گزرتی چلی گئی، سرخ و سپید چہرے، بھورے چہرے۔ مٹیالے چہرے۔ سانولے چہرے، چیچک زدہ چہرے، ہنستے ہوئے چہرے، گھورتے ہوئے چہرے۔ بے باک نڈر۔ وحشی ظالم، معصوم چہرے۔ لیکن سب انسانوں کے چہرے، ان کے بھائیوں کے چہرے۔ اسی زمین کے چہرے، اسی مٹی، اسی ماحول کے چہرے، وہ چہرے جیسے اب جاگ اٹھے تھے۔ اور آنکھیں کھول کر اپنے وطن کو دیکھ رہے تھے شہباز کی آنکھوں سے، زمان خان کی آنکھوں سے

مر گئے۔ سب مر گئے۔

نثار۔ کرم داد۔ بختی۔ عبداللہ ... ...

شہباز نے آہستہ سے پوچھا: "یہ جنگ کیوں ہوتی ہے؟"

"حوالدار سے پوچھو" زمان خان نے جواب دیا۔ اور اپنے سینے پر لٹکے ہوئے بہادری کے تمغے کو سہلایا۔

"سپاہی کیوں مرتے ہیں؟" شہباز خان نے پوچھا

زمان خان چپ رہا۔

"فرض کرو" شہباز نے پھر پوچھا: "ہر سپاہی اور دنیا کا ہر آدمی لڑنے سے انکار کر دے۔ تو ... ... "

"تو دشمن جیت جائے گا" زمان خان نے جواب دیا

"مگر دشمن! دشمن کون ہو گا؟"

"حوالدار سے پوچھو" زمان خان نے سختی سے کہا، اور شہباز چپ ہو گیا۔

گاڑی چیختی ہوئی چٹانوں کے بلند سلسلوں میں سے گزرتی آگے چلی گئی۔

"اب میرا جہلم آئے گا" زمان خان نے غرور سے کہا

"ہوں! میرا چکلالہ ابھی دور ہے" شہباز نے افسردہ ہو کے کہا، پھر اک لطیف سی مسکراہٹ صبح کی نازک کرن کی طرح اس کے سانولے چہرے پر بکھر گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "ممکن ہے میری بیوی سٹیشن پر آئی ہو"

"ہوں؟" زمان خان نے سختی سے کہا۔ وہ ابھی کنوارا تھا۔

"اور میرا بیٹا بھی ... ... جب میں بھرتی ہوا، وہ ایک سال کا تھا،
میں سوچتا ہوں اب وہ کتنا اونچا ہو گا"

"رائفل اتنا" زمان بولا

"وہ مجھے پہچانے گا بھی؟" شہباز خاں نے خوابیدہ لہجے میں اپنے
آپ سے کہا۔

"ہاں حرامی ہوا تو کیسے پہچانے گا تمہیں" زمان خان نے جواب دیا
پہلے لمحے میں شہباز خاں نے معصوم خوابیدہ نگاہوں سے زمان خان
کی طرف دیکھا۔ اور پھر اک جھٹکے سے دوسرے لمحے میں اس دنیا میں لوٹ
آیا۔ اس نے زور سے زمان خان کے سینے پر گھونسا مارا۔ اور زمان خان ہنستے
ہنستے دہرا ہو گیا۔

شہباز خاں گالی بکنے لگا: تیری ماں ——— بہن ——— سور
دے پتر" ———

زمان خان ترکی بہ ترکی جواب دینے لگا۔

وہ دیر تک اسی طرح غزل خواں رہے حتیٰ کہ جہلم کا اسٹیشن آگیا

زمان خان المعروف بہ جتا، جہلم کے اسٹیشن پر اپنی انگریزی بیساکھی
سنبھالے لنگڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اللہ قلی نے اس کا بوجھل بستر اور بھاری
بھرکم ٹرنک اتار کر اس کے قریب رکھ دیا۔ زمان خان نے نہایت احتیاط
سے اپنی چیزوں کو گنا۔ ایک بستر اور ایک ٹرنک، ایک بستر اور ایک ٹرنک،

ایک بستر اور ایک ٹرنک، چھ سال کی طویل جنگ کے بعد وہ صرف ایک بستر اور ایک ٹرنک اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اپنی ایک ٹانگ لڑائی کی نذر کر آیا تھا۔ اس کی سیاہ گھنی، خوفناک مونچھوں کے بال غصے سے تن گئے۔ اور اس کے سرخ سرخ گال گرم ہو کر تانبے سے ہو گئے۔ اور اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں اک وحشیانہ نفرت کا موہوم سا جذبہ پھرنے لگا۔ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے انھیں استوار کیا۔ اپنی صاف شفاف مضبوط تھوڑی کھجائی، اپنے چوڑے چکلے سینے پر بہادری کے تمغے کو سہلایا۔ اور پھر گھوم کر ڈبے کی کھڑکی کے سامنے اٹن شن ہو گیا۔

"خدا حافظ بابے! (شہباز)" زماں نے کہا

"خدا حافظ چچے (زماں)" شہباز نے جواب دیا

"خط لکھنا!"

"ضرور!"

(خاموشی)

"اپنے گاؤں پہنچ جاؤ گے یا میں تمھارے ساتھ چلوں؟" شہباز نے زماں خاں کی بیساکھی کی طرف دیکھ کے کہا۔

چچے کو اس ہمدردانہ لہجے میں بھی تضحیک کی بو آئی۔ وہ اور بھی تن کے کھڑا ہو گیا۔ اور شہباز سے آخری بار اپنے ہاتھوں کی پوری قوت سے مصافحہ کرتے ہوئے بڑی مستعدی سے بولا "نہیں۔ نہیں۔ اس میں کیا بات ہے یوں ہنستے کھیلتے چٹکی بجاتے گھر پہنچتا ہوں۔ واہ اس میں کیا بات ہے"

گاڑی چلنے لگی تو شہباز نے کہا: "یار جُمّے"

"ہاں بلبجے!"

"جنگ اتنی بری تو نہ تھی، ہاں اگر تمہاری یہ ٹانگ سلامت رہ جاتی ... اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ اب تم لنگڑے ہو گئے پیارے"

شہباز کا ہنستا ہوا چہرہ دور تک کھڑکی میں نظر آتا رہا۔ زمان خان غصے سے مغلوب ہو کر خاموش رہ گیا۔ اور دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ اور اپنی بیساکھی کو غیض و غضب میں پلیٹ فارم پر پٹختا رہا۔

قلی نے کہا "سائیں!"

"حرامی" زمان خان نے زیرلب شہباز کو گالی دیتے ہوئے کہا

"کسے حرامی کہتا ہے؟ حرامی تو تیرا باپ" قلی برافروختہ ہو کے بولا "بڑا آیا ہے سپاہی کہیں کا۔ لاٹی کبین کا بچہ، چلا ہے گالی بکنے، یاں تجھے ایسے سپاہی دن رات آتے ہیں۔ زبان سنبھال کے بات کر ورنہ بیساکھی اُلٹی چونڑوں میں گھسیڑ دونگا۔ مجھے کوئی ایسا ویسا قلی نہ سمجھنا۔ ذات کا بلدیال ہوں بلدیال ... ..."

"ارے چھپکلی کے ... ... میں بھی بلدیال ہوں"۔ زمان خان مسرت سے چہکا: "اٹھا بستر اور ٹرنک ڈھولکی کے۔ میں بھی تیرا بھائی ہوں۔ تو کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"کوہ مری کا"

زمان خان نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا "سور دا پتر..."

اپنی قوم کی شان ہی نرالی ہے! قسم خدا کی، اپنی رجمنٹ میں جتنے بلدیال جوان تھے سب کے سب اول نمبر کے حرامی اور اکڑ خاں۔ کیا مجال جو ناک پر مکھی بیٹھنے دیں۔ اور لڑنے میں ایسے جیسے شیر۔ سب کے سب بہادری کے تمغے حاصل کر چکے ہیں ... ... ہیں!"

فلی نے ٹرنک سر پر اٹھایا۔ بستر بغل میں دبایا۔ اور بیساکھی کی طرف اشارہ کر کے بولا "لو اب یہ بیساکھی بھی مجھے دیدو"

"بیساکھی تجھے دیدوں تو کیا میں تیری ٹانگوں سے چلوں گا۔ سور دے پتر!"

فلی ہنستے ہنستے اسٹیشن کے باہر آ گیا۔ زمان خان اُسے پیسے نکال کے دینے لگا۔ تو فلی نے کہا "میں تجھ سے پیسے لونگا! واہ۔ تو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ تو جنگ سے آیا ہے جوان اور ـــــ" اس نے بیساکھی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر زمان خان کا چہرہ دیکھ کے رک گیا۔ اُسے عین وقت پر کھانسی آ گئی کھانستے کھانستے بولا "تو بھی بلدیال ہے۔ اپنا بھائی ہے۔ چلا جا۔ جوان خدا تیری پنشن میں برکت دے"

زمان خان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی۔ ایک عجیب سی میٹھی مدھم بے نام سی مسکراہٹ جس میں شاید تبسم کم تھا اور آنسو زیادہ تھے۔ جس میں شاید آنسو کم تھے اور تشکر زیادہ تھا۔ جس میں شاید تشکر بھی کم تھا، اطمینان زیادہ تھا۔ جیسے یہ مسکراہٹ یہ سوچ کے مسکرا رہی ہو۔ میں اپنے وطن میں ہوں یہ میری زمین ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ یہ میرا گاؤں ہے۔ اس کی فضاؤں میں

میرے پہلے بچپن کے گیت ہیں۔ اس کی مٹی میں میری محبوب کے قدموں کا رقص ہے۔ اس کے آسمانوں میں میرے سندر سپنوں کے چاند تارے ہیں یہاں خاموشی ہے۔ یہاں خوشی ہے۔ یہاں امن ہے ... اور ماں ممتا کی گود ہے، یہاں کوئی اجنبی نہیں۔ کوئی غیر نہیں۔ کوئی دشمن نہیں۔ زمان خان نے اپنے گلے میں پھندا سا محسوس کیا۔ اور وہ ہولے ہولے بیساکھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اسٹیشن کی سیڑھیاں اتر کر تانگے میں بیٹھ گیا۔

تانگے والے نے پوچھا: "شہر جاؤ گے جوان؟"

"نہیں"

"گاٹالیاں جاؤ گے جوان؟"

"نہیں ... میں کچے گاؤں جاؤں گا۔ جہلم کے اس پار نہیں اس پار۔ ذرا تانگہ فروٹ کرے تو میں دن ڈھلتے ہی گھر پہنچ جاؤں گا"

"چل اوئے سوہنیاں جھانجھناں والیا!" تانگے والے نے گھوڑے کو تیز کرتے ہوئے کہا۔ گھوڑے کے گلے میں گھنگھرو جھنجھنا اٹھے۔ اور اس کے سر کی سرخ کلغی فضا میں ڈوبنے اور ابھرنے لگی۔ ڈوبتے اور ابھرنے لگی، اور زمان خاں اپنی بیساکھی سنبھالے دوسرا پاؤں سیاہ ٹرنک پر رکھے کچے گاؤں روانہ ہوا۔

×

کچے گاؤں کے قریب زمان خان نے تانگے والے کو آہستہ چلنے

کے لئے کہا۔ سامنے گاؤں کی چوحدی اور شاملات دیہہ، اور پرے جہلم
کا دریا۔ اور اس کے دوسرے کنارے ریاست کشمیر کی سرحد پر گاٹالیاں کی چنگی
دریا کی پرشور روانی کی مدھم گونج اس کے کانوں میں آنے لگی، اور دریائی
گھاس کی خوشبو اس کے نتھنوں میں سرائت کرتی گئی۔ کھیتوں میں سے فصل
کاٹی جا چکی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے پیلے پیلے ٹھنٹھ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے
تھے۔ اور اُسے وہ چھوٹی چھوٹی قبریں یاد آئیں جن پر ہزاروں چھوٹے چھوٹے
صلیب اُگے ہوئے تھے۔ جنگ کی فصل کاٹی جا چکی تھی۔ اور اس کی ٹانگ
بھی اسی سلسلے میں کٹ گئی تھی۔ اور اب بھوری مٹی میں پیلے پیلے ٹھنٹھ باقی
رہ گئے تھے۔ شام ہو چلی تھی۔ اور راستے کے کنوئیں پر سے لڑکیوں کا آخری
جھرمٹ پانی لے کر گاؤں واپس جا رہا تھا۔ وہ کبھی اس سرس کے درخت کی اوٹ
میں کھڑا زیناں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ دھوپ ڈھل جاتی۔ اور میرپور کی گھاٹیوں
پر سرمئی غبار پھیلنے لگتا۔ اور ڈھور ڈنگروں کی گھنٹیاں بجتے بجتے باڑوں میں
خاموش ہو جاتیں۔ اور چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔ جیسے محبت کی میٹھی اداسی
چاروں طرف چھا گئی ہو۔ اور وہ کھیتوں کے بیچ میں گزرتی ہوئی پگڈنڈی
کی طرف دیکھتا رہتا۔ اور پھر وہ میٹھے میٹھے قدموں سے پگڈنڈی پر چلی آتی اور
ہر قدم پر زماں کے دل کی دھمک بڑھتی جاتی، بڑھتی جاتی، بڑھتی جاتی، حتیٰ کہ
جب وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچ جاتی، تو زماں کا سانس پھول جاتا اور
اکثر وہ کئی لمحوں تک خاموشی سے اُسے اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھتا۔ اور جب
اس کی سانس کی آمد ٹھیک ہوتی تو وہ اس سے بات کر سکتا۔

اور پھر جب کبھی زیناں کو موقعہ نہ ملتا۔ اور وہ نہ آسکتی۔ اور سناٹا زمان کو چاروں طرف سے گھیر لیتا۔ تو وہ سر جھکائے گاؤں کو لوٹ جاتا۔ راستے میں پلیا کی اوٹ میں وہ کسی پوٹھوہاری دوشیزہ اور اس کے محبوب کو دیکھتا۔ جو اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے ہوتے۔ تو اس کے دل میں درد سے گھاؤ پڑ جاتے۔ اور وہ اپنی محبوب بنجلی اٹھا کر جہلم کے کنارے آ نکلتا۔ اور اس کے سنہری تاگوں اور سرخ و سبز جھومروں سے کھیلتا ہوا بنجلی بجانے لگتا۔ اور گیت کا بہاؤ جہلم کے بہاؤ میں مل جاتا۔ اور خود اس کی روح پگھل کر اس کے ہاتھوں میں بہنے لگتی۔ اور بہتے بہتے جہلم کی سطح پر نکلتے ہوئے چاند کے ساحل سے ٹکرا جاتی۔ اور پھیلتے پھیلتے چاندنی کی نقرئی پھوار میں کھو جاتی اور اس وقت جیسے دھرتی کا ہر ذرہ اور پانی کا ہر قطرہ اور چاندنی کا ہر نغمہ میٹھے مدھم سانسوں میں زیناں زیناں کہہ کر پکارنے لگتا۔ زیناں جس کی رنگت میں سونا تھا۔ جس کی آواز میں بنجلی کا نغمہ تھا۔ جس کے قامت میں نیخ کی شاخ کا چھریرا پن تھا۔ اور پھر ———— زمان کو زیناں کی ہزاروں باتیں یاد آنے لگتیں۔ کچھ زمینی کچھ آسمانی، زمینی جیسے زیناں کا ہنسنا۔ اور ہنستے ہنستے اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ جانا۔ اور اس کی گردن کی قوس کا تل بالکل اس جگہ جہاں بالوں کی سیاہ لکیر گردن کی صباحت سے الگ ہوتی تھی۔ اور جسے وہ چومتے چومتے پریشان ہو جاتا تھا۔ اور آسمانی جیسے زیناں کا رونا اور من جانے پر روتے روتے آنسوؤں کے بیچ میں بھیگی ہوئی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھنا۔ جیسے جہلم کے ماتھے پر صبح جاگ جائے۔ مگر نہیں، جب

بھی نہیں۔ وہ رونا اور مسکانا کچھ اور ہی تھا۔ اس دنیا کا نہ تھا۔ یہی سوچتے سوچتے زمان خاں کا دم رکنے لگا۔

شام گہری ہوتی گئی۔ چودھری گزر گئی۔ تانگہ شاملات دیہہ سے آگے نکل گیا۔ ادھر بڑ کے گھنے سائے میں گاؤں کے نوجوان لڑکوں نے اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ یہاں ہر روز دنگل ہوتا تھا۔ صبح و شام دوپہر جب وقت کسی کو وقت ملتا۔ یہاں چلا آتا۔ مگدر ہلاتا۔ بینی پکڑتا۔ لنگوٹا کس کے پہلوانی کے داؤں آزماتا۔ اور جب ورزش سے تھک کر چور ہو جاتا۔ اور سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ جاتا۔ تو بڑ کی ڈال کے نیچے ہاتوں کا تکیہ بنا کر بھوری مٹی کو جسم پر مل کے سو جاتا۔ اور ایک آدھ گھنٹے کی میٹھی اور ٹھنڈی غنودگی کے بعد جہلم کے پانیوں میں نہانے لگتا۔

جنگ کے میدانوں میں اور کمین گاہوں میں جگہ جگہ زمان کو اپنا اکھاڑہ یاد آیا تھا وہ اپنے گاؤں کا چھبیلا جوان تھا۔ بینی پکڑنے میں مشاق۔ کشتی میں سب سے آگے، تیراکی میں ماہر، ہاں ڈنڑ پیلنے اور مگدر ہلانے میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ اکھاڑہ دیکھتے ہی تھپکی کے لئے اس کا ہات اپنی ران پر جا پڑا۔ اور پھر آگے اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے ٹھنٹھ پر اور وہ بے حد مغموم ہو گیا۔ اور غصے میں تانگے پر اکڑ کے بیٹھ گیا۔ اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

شکر ہے اس وقت اکھاڑے میں کوئی نہ تھا۔

"اب آگے کہاں چلوں جوان؟" تانگے والے نے تانگہ روکتے ہوئے کہا۔

"سیدھا پیر جی کے مزار کو لے چل پھر وہاں سے دائیں طرف کوئی سو گز ... ..."

پیر جی کے مزار پر اس نے منت مانی تھی۔ اس نے اور زیناں نے، جب وہ اور زیناں اس کے بھرتی ہو جانے کے بعد یہاں اپنے پیار کی قسم اٹھانے آئے تھے۔ کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔ یہاں انھوں نے پانچ پانچ آنے کی نیاز دی تھی۔ اور بڑی بیری کی شاخوں پر پوٹلیاں باندھی تھیں۔ اور رات کی تاریکی میں دعا مانگی تھی۔ کہ یہ محبت ہمیشہ قائم رہے، یہ سچائی سدا قائم رہے۔ اور محبت کا مہربان سایہ پیر جی کی برکت سے ان دونوں روحوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہے۔ جب پیر جی کا مزار آیا۔ تو زمان خان تانگے سے اتر کھڑا ہوا۔ اور تعظیم دے کر دعا مانگنے لگا۔ دعا مانگ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر پھیر کر اور پھر گھوم کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مزار کے طاق میں ایک دیا جھلملا رہا تھا۔ اور اس کے سامنے ایک لڑکی دوزانو بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ اور تاریکی میں روشنی کی زرد زرد تو لڑکی کے سیاہ آنچل میں چھپے ہوئے صبیح چہرے پر پڑ رہی تھی۔ زمان کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ اور گھبرا کے بولا "زیناں"

لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے زماں کی طرف دیکھا۔ اور زماں نے بھی دیکھا۔ کہ یہ کوئی اور ہے۔ کسی دوسرے گاؤں کی لڑکی جو یہاں شاید بیاہ کر آئی ہے۔

"معاف کرنا بہن" زماں بولا "میں نے سمجھا۔ میری زیناں ہے"

لڑکی چپ چاپ کھڑی رہی۔ زمان خاں بیساکھی سنبھالتا ہوا تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ آگے چلا گیا۔ لڑکی پھر جھک کر دوزانو ہو گئی۔ اس کی دعا بھی پوری نہ ہوئی تھی۔

مزار سے گھوم کر کوئی سو گز آگے چل کے تانگہ پھر رک گیا۔ سامنے اس کا گھر تھا۔ اور گھر سے دھواں نکل رہا تھا۔ اور گوشت کے بھننے کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی۔ اور بچوں کی تیز چیخیں۔ اور ان میں کبھی کبھی کسی مرد کی بھاری آواز اور پھر کسی عورت کی نقرئی ہنسی۔ اور ان سب کے اوپر ایک گراموفون کی بلند آواز تھی۔ اور گیت میں ماہیے کا بھور گیت ... پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اور جیسے زمان خاں کا دل بیٹھ گیا۔ تو یہ سب لوگ خوش تھے۔ بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور گو اس نے اپنی آمد کی کسی کو اطلاع نہ دی تھی۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا۔ کہ جب وہ گھر پہنچے۔ تو سارے لوگ گھر کے باہر دروازے پر اس کے انتظار میں چپ چاپ کھڑے نظر آئیں۔ اس نے ان کی خاطر جنگ لڑی تھی۔ اپنی ٹانگ کٹوائی تھی۔ اپنی جوانی گولہ بارود کی آتش سامانیوں میں خاکستر کر ڈالا تھا۔ اور آج جب سپاہی گھر پہنچا ہے۔ تو قہقہے ہیں۔ بچوں کی دھوم ہیں۔ گراموفون کے گیت ہیں۔ زندگی اسی طرح چل رہی ہے۔ جیسے کبھی لڑائی نہ ہوئی تھی۔ زمان خاں کبھی بھرتی نہ ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ کبھی کٹی نہ تھی۔ وہ کئی سالوں کے بعد گھر واپس بھی نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ کبھی اس گاؤں کا رہنے والا نہ تھا۔ اس گھر کا مکین نہ تھا۔ اچھا ہے تو وہ بھی سپاہی ہے۔ سپاہی رہے گا۔ یہ بہادری کا تمغہ اس کی آئندہ زندگی کا چہرہ بنے گا۔ اس نے اپنی مونچھوں

کو بل دیا۔ اور تانگے والے سے کہا: "گھر سے معراج دین کو آواز دے کر بلا لاؤ، کہنا زماں آیا ہے"

چند لمحوں کے بعد سارے گھر والوں نے تانگے کو گھیر لیا۔ اور اس کا بستر اور ٹرنک اٹھا کر اور خود اسے اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے۔ اس نے بڑی متانت سے اپنے سفید ریش باپ کو تعظیم دی۔ اپنی روتی ہوئی اماں کے گلے لگا، اپنے بڑے بھائی سے ملا۔ اپنے چھوٹے بھائی کو گلے سے لگایا۔ جو اس کی طرح جوان ہو چلا تھا۔ اپنی بہنوں کو کندھے سے لگا کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر کھاٹ پر بیٹھ کر بڑے مزے میں خوشی خوشی سے باتیں کرنے لگا لیکن لہجے میں تیقن نہ تھا۔ باتوں میں رس نہ تھا۔ اوپری اوپری سی باتیں جن کے اندر شاید کچھ اور ہی تھا۔

ابا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "جا معراج۔ چاچا حشمت کو بلا لا۔ اور برادری میں خبر کر دے۔ میرا بیٹا لام سے اللہ کے فضل سے سرخرو ہو کے آیا ہے"

اماں روتے روتے بولیں: "تو نے لکھا نہیں۔ تیری ٹانگ کٹ گئی۔"

"اماں ٹانگ کٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ دوسری ٹانگ مل گئی، لوہے کی ٹانگ۔ دیکھو میں بالکل ٹھیک چل سکتا ہوں۔"

وہ چل کے دکھانے لگا۔ پھر فتح مندی کے احساس سے سب کو متاثر کر کے کھاٹ پر بیٹھ گیا۔

بڑے بھائی نے کہا: "میں مرغ حلال کرتا ہوں" وہ سر کھجاتا ہوا آنگن سے باہر نکل گیا۔

چھوٹا بھائی بہادری کا تمغہ غور سے دیکھنے لگا: "کون سی لام پر ملا تھا یہ؟" اس نے جھجکتے جھجکتے اپنے بھائی سے پوچھا۔

"کرن کے محاصرے پر افریقہ میں۔ بڑا مورچہ تھا۔ گورے بھی لڑتے لڑتے ہار گئے تھے۔ آخری ہماری پلٹن کو بھیجا تھا وہاں۔ دسویں پنجاب رجمنٹ کے جوانوں نے کرن کا مورچہ ختم کیا۔ بڑے گھمسان کی لڑائی تھی۔ مجھے اور شہباز خاں کو کوئی دو سو گز اوپر چڑھ کر ایک مشین گن کے مورچے پر دستی گولہ پھینکنا تھا۔ ہم نیچے تھے۔ مورچہ اوپر تھا۔ اور دشمن مشین گن سے ہمارے سپاہیوں کو بھون رہا تھا۔ ہم لوگ جھاڑیوں میں چھپتے چھپتے زمین پر گھسٹتے گھسٹتے، سرکتے سرکتے اوپر بڑھتے گئے۔ اور آخر میں ہلہ بول کے مورچے کو صاف کر دیا۔"

"اور یہ ——" چھوٹے بھائی نے اور بھی زیادہ جھجک کے ساتھ رکتے رکتے کہا: "یہ ٹانگ اسی لڑائی میں گئی؟"

"نہیں" زماں خاں اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا: "یہ تو اطالیہ کے مورچے میں گئی۔ کمان افسر نے بلم چارج کا حکم دیا تھا۔ جرمنوں سے دو بدو بلم کی لڑائی ہوئی۔ اسی میں یہ —— (ہنس کر) میں تو شاید مر گیا ہوتا۔ مگر اللہ ... ..."

وہ یکایک چپ ہو گیا۔ کیونکہ برادری کے لوگ آ رہے تھے۔

وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملا۔ چاچا حشمت رونے لگے۔ خالہ رحمت رونے لگے۔ ہر کوئی اسے دیکھ کے ایک لمحے کے لئے اداس اور غمگین ہو جاتا۔ اور پھر آنسوؤں کے بیچ میں مسکرا کر اس کے سر پر ہات پھیرنے لگتا لیکن زماں خان ہر ایک سے بڑی خوشی سے ملا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جیسے ٹانگ کا کٹ جانا روزمرہ کی بات تھی۔ وہ جنگ کے واقعات سناتا گیا۔ اور واقعات کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتا گیا۔ اور ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں بھی بیان کرتا گیا تاکہ لوگ اس کی کٹی ہوئی ٹانگ کا قصہ بھول جائیں۔ پھر بھی لوگوں کی نگاہیں ادھر پڑ جاتیں۔ اور عورتیں سرگوشیاں کرنے لگتیں۔ اور اس کی ماں تو ہر نئی عورت کے آنے پر اپنے بیٹے کا قصہ لے بیٹھتی۔ اور رونے لگتی۔ گاؤں کے سارے مرد آئے اور گاؤں کی ساری عورتیں آئیں۔ اور گاؤں کے سارے بچے آئے۔ اُسے دیکھنے کے لئے۔ ان میں وہ بچے بھی شامل تھے۔ جو اس کے جنگ میں چلے جانے پر پیدا ہوئے تھے۔ ان میں وہ بچہ بھی تھا۔ جو اب زیناں کی گود میں تھا۔ اور جسے وہ اٹھائے ہوئے اسے ملنے کے لئے آئی تھی۔

جب زیناں آئی۔ تو جیسے ایک لمحہ کے لئے ساری محفل پر خاموشی چھاگئی۔ منجھلی بہن نے جو گراموفون ریکارڈ بجا رہی تھی۔ زیناں کو دیکھ کے ریکارڈ بند کر دیا۔ سب کی سانسیں رک گئیں۔ زماں نے زور سے سانس اندر کھینچا۔

اماں نے زیناں کو دیکھ کے جلدی سے کہا: "خیر سے زیناں کا بیاہ ہو گیا ہے۔ خیر سے یہ اس کا بچہ ہے۔ اسے دعا دو بیٹا۔ خیر سے "

زماں نے بچے کو گود میں لیا۔ اُسے پیار کرنے لگا۔ اس نے اُسی

خوشی کے انداز میں زیناں سے کہا : اچھی تو ہو " ؟

زیناں جھکی جھکی کھڑی رہی ۔ پھر اکدم بہت سے لوگ باتیں کرنے لگے ۔ بہت سی ضروری اور غیر ضروری باتیں ۔ اور ریکارڈ بجنے شروع ہو گئے ، اور زیناں اپنے بچے کو لے کے عورتوں میں چلی گئی ۔ اور زماں ہنس ہنس کر اپنے گاؤں والوں ۔ اپنی برادری والوں اور اپنی بہنوں بھائیوں سے باتیں کرتا رہا ۔ حتیٰ کہ ایک ایک کرکے سب لوگ چلے گئے ۔ پھر دسترخوان بچھا اور اس نے گھر والوں کے ساتھ کھانا کھایا ۔ اور انھیں سپاہیوں کے لطیفے سنا سنا کے ہنساتا رہا ۔ پھر گھر کے لوگ سو گئے ۔ اور بڑی لالٹین بجھا دی گئی ۔ اس کے سرھانے طاق پہ دیا روشن رہا ۔ اور وہ اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے دیر تک چھت کی کڑیاں گنتا رہا ۔

اس کی اماں نے کانپتے ہوئے ہاتوں سے اپنا ٹرنک کھولا ۔ اور اس میں سے ایک فوٹو نکال کر اس کے سامنے لائیں ۔ یہ فوٹو بھرتی ہونے کے وقت لیا گیا تھا ۔ وہی زماں تھا ۔ وہی اکڑ ، وہی چھاتی ، وہی مونچھیں ۔ لیکن اس فوٹو میں دو ٹانگیں تھیں ۔

اماں نے کہا : بیٹا ۔۔ بیٹا ... "

زماں دیر تک فوٹو دیکھتا رہا ۔ اور اپنی دوسری ٹانگ کو جو اب کٹ چکی تھی ۔ ایک عجب مسکراہٹ سے تکتا رہا ۔ پھر اس نے فوٹو اماں کو واپس کر دیا " اماں اب سو جاؤ ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے ، بڑے مزے میں ہوں ! " ۔

اماں روتی روتی اس کی چارپائی سے اٹھ گئیں۔ اور وہ دیر تک چھت کی کڑیاں گنتا رہا۔

آخر چھت کی کڑیاں گنتے گنتے ختم ہو گئیں۔ نیند پھر بھی عنقا تھی۔ وہ آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ اور لحاف پر سے اپنی بنجلی اٹھالایا۔ وہی بنجلی تھی، وہ سنہری تاگے اور سرخ و سبز جھومر۔ اس نے بنجلی کو منہ سے لگایا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ اماں کو اشارے سے بتایا، میں دریا کے کنارے جا رہا ہوں۔ اور پھر بیساکھی سنبھالے باہر نکل گیا۔

بنجلی پانیوں میں گونجنے لگی۔ اور میٹھی یادیں درد کی تصویریں بن بن کر اس کے دل کے ویرانے کو معمور کرتی گئیں۔ تصویریں ابھری چلی آرہی تھیں۔ جب وہ اور زیناں پہلی بار ملے تھے۔ جب اس نے زیناں کو پہلی بار چوما تھا۔ جب زیناں اور اس نے پہلی بار ایک دوسرے کا جھوٹا کھانا کھایا تھا۔ جب وہ اور زیناں پہلی بار اکٹھے ہمسلم شہر میلے میں گئے تھے۔ تصویریں ابھری چلی آرہی تھیں۔ اور بنجلی کا نغمہ گویا ان کی دھار بنتا۔ ہر تصویر جب ابھرتی چھید دی جاتی × × × ، ختم، ختم، ختم، آخر میں کوئی تصویر نہ رہی۔ بنجلی کا نغمہ بھی نہ رہا۔ صرف ہوا کی سسکیاں تھیں، اور چھٹی رات کے چاند کا زرد رو چہرہ، اور ساحل پر ریت کے کنارے کے گرنے کی اندوہناک آواز، جیسے ہر چیز دریا میں گر کے ڈوب جائے ...

وہ دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ اور مٹھیوں میں ریت بھر بھر کے پانی میں پھینکتا رہا۔ پھر اس نے اپنے پیچھے اک آہٹ سی محسوس کی، اور اک لانبے

سائے کو اپنے پیچھے کھڑا پایا۔

وہ آہستہ سے اٹھا، اور گھوم کر زیناں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

زیناں نے کہا:۔ "میں تمھاری گناہ گار ہوں"

زماں خاموش رہا۔ مگر اس کی روح کے اندر موت اور زندگی کی جنگ شروع ہو رہی تھی۔

"مجھے جہاں چاہو لے چلو"

زماں خاموش رہا۔ مگر اس کے دل کے اندر بمب اور توپ کے گولے چھوٹ رہے تھے۔ اور خوفناک دھماکوں کا شور اس کے اعصاب کو چھید کر ڈالتا تھا۔

"میں تمھاری ہوں"

زماں کے کلیجے پر اک برچھی سی لگی۔ لیکن وہ اس وار کو بھی سہہ گیا خاموش رہا۔ دیر تک خاموش رہا۔ دیر تک وہ ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ اور زرد رو چاند خاموش رہا۔ اور دریا کے کنارے لانبی لانبی دریائی گھاس سسکیاں بھرتے بھرتے خاموش ہو گئی۔ اور خاموشی کا بے گونج نغمہ پھیلتے پھیلتے ساری کائنات پر چھا گیا۔ باہر خاموشی تھی۔ اندر جنگ تھی۔ اور کسی کو پتہ نہ تھا۔ کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔

زیناں نے کہا:۔ "اس وقت کوئی دیکھتا نہیں ہے۔ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ ڈالو، اور میری لاش کو جہلم میں پھینک دو۔ مگر خدا کے لئے یوں چپ چاپ نہ کھڑے رہو"

یکایک زمان کے چہرے پر اک مسکراہٹ آگئی۔ چھٹ کے چاند کی طرح زرد اور ادھوری۔ پہلے اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اب اس کا سر بلند ہوا۔ اس نے آہستہ سے زیناں کا ہات پکڑا۔ اور بڑی ملائمت سے کہنے لگا "آؤ بہن تمہیں، تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ تمہارا بچہ۔ تمہارا خاوند اس گھر میں تمہاری راہ تک رہے ہوں گے "

×

زماں زیناں کو گھر چھوڑ آنے کے بعد جب لوٹا۔ تو پیر جی کے مزار پر طاق میں دیا بدستور جل رہا تھا۔ ایک پوٹھوہاری دوشیزہ دیئے کے سامنے دوزانو ہو کر ہات اٹھائے دعا مانگ رہی تھی۔ چاروں طرف تاریکی تھی، اور سناٹا تھا۔ صرف دیئے کی لو میں زماں اس حسینہ کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ جس کی بند آنکھوں سے محبت کے جھرنے رواں تھے ... ...

معاً زماں بھی جھک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس کے ہات دعا کے لئے اوپر اٹھ گئے۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر کوئی دعا نہ آئی۔ اور اس کے دل سے اور اس کی روح سے کوئی آواز نہ نکلی۔ صرف اس کی خاموش آنکھوں سے ٹپا ٹپ آنسو بہنے لگے ... ...

سمندر بہت دور ہے

نو بج گئے۔

باب الہند کی رونق بہت کم ہو گئی، اچھلتے کودتے پھلانگتے ہوئے شریر بچے اپنی آیاؤں کے ساتھ موٹروں میں سوار ہو کر گھروں کو چلے گئے۔ کلرکوں نے اپنی بیوی بچوں کو تفریحی اسٹیمر میں پندرہ منٹ سیر کرانے، سیو پوری کھلانے اور کچے ناریل کا پانی پلانے کے بعد چرچ گیٹ اسٹیشن کی راہ لی، گجراتی اور مارواڑی سیٹھوں کے منیموں نے اپنی داشتاؤں سے ملاقات کے جو اوقات مقرر کر رکھے تھے، وہ ان کے مطابق سپید براق دھوتی پہنے، پمپ شو کی چرر چرر کی تان پر فلمی گیت

گاتے ہوئے پہنچ گئے، اور پھر ان لوگوں نے اپنی داشتاؤں کو اپنی سود کی پوتھیوں کی طرح بوچا اور سستے ہوٹلوں کی راہ لی۔ کوئی جوہو چلا گیا، کوئی وکٹوریا ٹرمنس کے عقب میں، کوئی کولابے، کوئی ٹیکسی میں بیٹھ کے گیا۔ تو کوئی گھوڑا گاڑی میں۔ کوئی سیکنڈ ہینڈ موٹر میں، ہر منیم کے پاس ایک پوتھی تھی۔ ایک پوتھی وہ دکان میں بند کر کے آیا تھا۔ دوسری پوتھی کھولنے جا رہا تھا۔ اور اس کے دل میں شبر بازار کے اشلوک تھے۔ اور ہونٹوں پر دیسی شراب کے بھپارے تھے اور آنکھوں میں ننگا زنا تھا۔ سود در سود کی طرح مضحکہ خیز اور جان لیوا،

ساڑھے نو بج گئے،

باب الہند پر اکا دکا جوڑے ہی رہ گئے۔ ادھیڑ عمر کے جوڑے جو جوانی حسرتوں کے ویرانے میں گزار کے اب ذرا فراغت کی زندگی بسر کرنے کی توفیق حاصل کر چکے تھے۔ بچاروں کا جی سمندر کے کنارے سے اٹھنے ہی کو نہ چاہتا تھا۔ اور پھر ایسا سمندر جس پر ہر آن لاکھوں مہتاب ٹوٹتے ہوں، اور روشنی کے کنول کھلتے ہوں، اور مغربی محبت کے گیت گونجتے ہوں، جہاں کف آلود لہروں کے نقرئی تاج بڑھتے بڑھتے، ساحل کی طرف آتے آتے تاج کی رنگا رنگ روشنیوں میں ہزاروں ترشے ہوئے ہیروں موتیوں لعلوں سے مزین ہو جاتے ہوں۔ اور دور پرے سمندر میں جہاز کھڑے ہوں، اور ان پر مدھم مدھم دھمک کے ساتھ عرشے پر ناچ ہو رہا ہو۔ اور سامنے ہر طرف سمندر ہو اور لہریں ہوں۔ اور اپنا ہاتھ محبوب کی کمر میں ہو۔ اور محبوب کی عمر چالیس برس سے اوپر ہو۔ اور اپنی پچاس کے قریب، اور تنخواہ پانسو کے قریب ہو۔ اور چھ بچے ہوں۔ اور ایک ننھی منی سی موٹر کار، تو کہنے

ساڑھے نو بجے بھی باب الہند سے اٹھنے کا نام کون لیگا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے جب باب الہند ویرانہ سا معلوم ہوتا ہے، باب الہند کے مقابل تاج اور گرین کے سجتے ہوئے برامدے میں ناچ زوروں پر ہوتا ہے۔ معمولی حیثیت والے شرفا تو اکثر آٹھ بجے ہی تاج اور گرین میں آدھمکتے ہیں۔ لیکن بڑے بڑے جعاندی سیٹھ، اور بڑے بڑے نیتا، اور بڑے بڑے جوہری، اور ہر وہ بڑا چور جو دو چار ملوں، پانچ سات ہزار مزدوروں اور لاکھوں روپوں کا مالک ہوتا ہے ساڑھے نو بجے کے بعد ہی نشاط گاہوں میں آتا ہے۔ لباس نہایت معمولی۔ لیکن بے حد صاف ستھرا، ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ، اپنی امارت کی جلا سے دمکتی ہوئی آنکھیں مہنگی مغربی شراب کے مبہم نشے میں تیرتی ہوئیں۔ جیسے ہفت لال سوئمنگ پول کی ہندو جل پریاں، پانی کے نیلگوں سیال سبزہ زار میں رقص خیز، ایسی خوبصورت آنکھیں لاکھوں آدمیوں کو اندھا کر کے ہی جگمگاتی ہیں۔ ایسی منقطر مہک لاکھوں بے ایمانیوں کو ابال کر ہی پیدا ہوتی ہے، ایسا تبسم لاکھوں دلوں کی امنگوں کو سڑا کر ہی وجود میں آتا ہے۔ سیٹھ جتنے معمولی سے کپڑے پہنے ہوں گے، ان کی محبوبہ اتنے ہی فوق البھڑک کپڑے پہنے زیوروں سے لدی پھندی روژ اور غازے میں لتی پتی اپنا بازار سجائے نظر آئے گی۔ سیٹھ مندر میں تو اپنی بیوی کے ساتھ جاتے ہیں۔ لیکن تاج اور گرین میں ہمیشہ اپنی محبوبہ کے ساتھ آتے ہیں اور جو گاڑی وہ ایک روز لاتے ہیں۔ اسے دوسرے روز بدل دیتے ہیں۔ مثلاً آج سیٹھ رنچھوڑ لال یا نیتا جی کیکا بھائی۔ یا للو لال جی جوہری یا سین بھائی پیر بھائی گھوڑے
[illegible] گرین میں آئیں گے تو دوسرے رنگ کی [illegible] کار ہوگی، اور ساتھ لے

رنگ کی محبوبہ ہوگی۔ اور دوسرے دن جب آئیں گے۔ تو کالے رنگ کی بیوک اسٹ ہوگی، اور سفید رنگ کی محبوبہ ہوگی۔ لیکن ماڈل دونوں کا نیا ہوگا۔

گو انگریز ہندوستان سے چلے گئے ہیں۔ لیکن بڑھیا ہوٹلوں میں کھانا ابھی تک انگریزی ملتا ہے۔ لباس بھی انگریزی ہوتا ہے، شراب بھی انگریزی، ناچ بھی انگریزی، اور زبان بھی انگریزی، پھر بھی سنتے ہیں انگریز ہندوستان سے چلے گئے ہیں گو آجکل میزوں پر ہر بڑے سیٹھ کی بغل میں ایک موٹا سا انگریز ضرور ہوتا ہے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ موٹا گنجا انگریز آج کل یہاں کیا کر رہا ہے۔ لیکن جب تعارف ہو جائے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ

(۱) سیٹھ بنا سیٹی کی میز پر مسٹر جونسن تشریف فرما ہیں۔ سیٹھ بنا سیلتی کے کارخانے میں مسٹر جونسن کے انگریزی کارخانے کی موٹروں کے پرزے جوڑے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان موٹروں کو ہندوستانی لباس عطا ہوتا ہے۔

(۲) سیٹھ منی بھائی روگھٹ کی میز پر مسٹر اسمتھ براجمان ہیں۔ مسٹر اسمتھ کا امریکہ میں دوائیوں کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اور سیٹھ منی بھائی بھی کیمیکل انڈسٹریز کے ڈائرکٹر ہیں۔ اور سودیشی دوائیں بیچتے ہیں۔

(۳) یاسین افضل بھائی گھوڑے والے کے ساتھ جو دبلا پتلا لانبا غیر ملکی ہے وہ یورپ میں فرانس اٹلی اور سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ اور امریکہ میں بھی وہ جیب ریڈیو بنانے کے کارخانوں کا مالک ہے۔ اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یاسین افضل بھائی گھوڑے والے آج کل ہندوستان میں ایک ریڈیو سٹ تیار

کر رہے ہیں۔ جو بقول اُن کے عوامی ریڈیو ہوگا اور ہندوستان کے عوامی باشندوں کی بہبودی کے لئے ہوگا۔ اور بہت سستا ہوگا۔ صرف ایک سو روپے میں ملے گا۔ ہندوستان کا پہلا عوامی ریڈیو جسے برطانیہ امریکہ فرانس اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے ایک ریڈیائی کارٹل نے ایجاد کیا ہے۔ کیا بولی بولے گا یہ ریڈیو۔ یہ جمہوری عوامی ریڈیو؟۔

ٹھیک دس بجے سے ناچ کی آخری نشست شروع ہوتی ہے۔ ناچ گیارہ بجے بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے جتنا ناچنا ہے ناچ لو۔ شراب جتنی پینی ہے پی لو۔ کمر کو جتنا بھینچنا ہے۔ بھینچ لو۔ خوشی کا راشن گیارہ بجے تک ملے گا۔ اس کے بعد راشن کی دکان بند ہو جائے گی۔ اور انگریزی بینڈ بینڈ سے مانزم کے سُر تھرتھرا کر خاموش ہو جائے گا۔ سیٹھو، بیوپاریو، تجارو، شیر بازار کے دلالو۔ بھاگو، بھاگو۔ بینڈ کی گت پر بھاگو۔ خوشی کو دبوچ لو۔ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ اس کا گلا دبا لو کہیں وہ غائب نہ ہو جائے۔ اس کی شہ رگ کھول کر اس کا خون پی جاؤ۔ کیونکہ اس خوشی کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ اس لئے ناچو، ناچتے جاؤ، ایک ہی دائرے میں ناچتے جاؤ۔ گھوم پھر کر پھر وہیں۔ گھوم پھر کر پھر وہیں۔ دائرے سے باہر نہ نکلنا۔ اس کے باہر موت ہے تمہاری!

ٹھیک دس بجے تاج کے عقب میں ایک لمبے چوڑے گراج سے سیٹھ پھول چند جو اپنے آپ کو فول چند کہتے ہیں ڈی سوٹو میں سوار ہو کر نکلتے ہیں گرین کی جانب، اور ان کے نکلنے کے بعد، گراج کے عقب میں ایک سرخ بتی روشن ہوتی ہے۔ اور پھر وہ پھر دھڑکتا ہے۔ اور تنگ دروازے کے اندر ایک بڑی سی کرسی

پر سیٹھ پھول چند کا پنشن یافتہ حبشی ڈرائیور ایک زرکار سرخ چوغا پہن کر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور سیٹھ کی کار کے غائب ہوتے ہی چلا کر کہتا ہے۔

بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز ہیں، سلامی دو گنتو۔

اور پھر کتنے دو ایک، ایک دو کر کے گراج کے بالکل اندر حبشی ڈرائیور کے کمرے میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور سر جھکا کر سلام کر کے دو زانو ہو کر اپنے بادشاہ سلامت کے حضور میں سلامی دیتے ہیں۔

حبشی ڈرائیور پوچھتا ہے۔ ٹھرو کیا لائے؟

ٹھرو گجراتی جیب کترا ہے پچیس سال سے بمبئی میں یہی کاروبار کر رہا ہے کسی کی جیب کاٹنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ ہر بڑا تاجر یہی کرتا ہے۔ ہر بڑا کارخانے دار یہی کرتا ہے۔ ہر بڑا سرمائے دار یہی کرتا ہے۔ ٹھرو کا ضمیر اس معاملے میں بالکل راہ راست پر ہے۔ اس کے دل میں ایمان کی مشعل اسی طرح جگمگا رہی ہے جس طرح برلا مندر کے اندر کی قندیل۔ چھ سات بار جیل جانے کے بعد بھی یہ روشنی نہیں بجھی۔ یہ روشنی اتنی آسانی سے نہیں بجھائی جا سکتی۔ ہر جیل میں جانے والا اس امر سے بخوبی آگاہ ہے۔

ٹھرو جواب دیتا ہے۔ ساڑھے تین سو روپے

ایک سو روپیہ ادھر لاؤ

ٹھرو ایک سو روپے کی نذر پیش کرتا ہے

موہن سنگھ تم کیا لائے؟

موہن سنگھ راجپوت قوم سے ہے۔ اور بمبئی میں کوکین فروشی کرتا ہے

لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ۔ تلوار کبھی تو قوم ملک اور عزت کے لئے تھوڑی چلائی جاتی ہے ۔ تلوار کبھی تو پیسے کے لئے چلائی جاتی ہے ۔ سپاہی بے چارہ کہاں لڑتا ہے وہ پہلے تو بھرتی کیا جاتا ہے ۔ پھر مار پیٹ کے پریڈ قواعد کرا کے گھوڑے کی طرح سدھایا جاتا ہے ۔ پھر اسے شراب پلا کے اور اس کے ہات میں ایک بندوق تھما کے اس سے کہا جاتا ہے ۔ جاؤ بیٹا ۔ سدو ، محمود ۔ رحمان لکشمن لڑو ۔ اور وہ لڑتا ہے ، نہیں لڑایا جاتا ہے ۔ اور پھر وہ مر جاتا ہے ۔ نہیں مروایا جاتا ہے ۔ اور پھر اس کی قبر پر کسی بڑے جھوٹ کا محل تعمیر ہوتا ہے ۔ کسی بڑے نیتا کی خوشیاں سربلند ہوتی ہیں ۔ کسی اونچے طبقے کی دستار میں کلغی لگتی ہے ۔ لیکن خون ایک معمولی سپاہی کا ہوتا ہے ہمیشہ ۔ کبھی تو وہ آزادی کا سپاہی ہوتا ہے ، کبھی جمہوریت کا ، کبھی قومی عزت کا ، کبھی تہذیب اور کلچر کا ۔ درحالیکہ اس کی زندگی میں نہ کبھی عزت آتی ہے ۔ نہ تہذیب ، نہ کلچر ، نہ آزادی ، نہ جمہوریت ۔ اور وہ ان تمام چیزوں کی حسرت اپنے دل میں لئے اپنا بھوکا پیٹ پکڑے مر جاتا ہے اور دنیا اُسے راجپوت کہتی ہے ۔ اور اس کا جس گاتی ہے ۔

موہن سنگھ بھی ایک راجپوت تھا ۔ لیکن اسے تلوار سے بڑی نفرت تھی ، وہ کہتا تھا ۔ میرے آبا و اجداد کا زمانہ اچھا تھا ۔ وہ لوگ تلوار ہات میں لے کر نکل جاتے اور اپنے لئے ایک چھوٹی سی سلطنت تعمیر کر لیتے ۔ سلطنت نہ سہی تو ایک معمولی سی ریاست ، ایک چھوٹی سی جاگیر چلئے ایک معمولی سا گاؤں ہی سہی ۔ کچھ نہ کچھ تو مل جاتا تھا ۔ آجکل تلوار چلا کر جیل کی چکی پیسنے کو ملتی ہے ۔ کون تلوار چلائے ۔ اور اگر سپاہی بن جاؤ تو بھی تلوار چلانے سے کون سے محل کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ ساٹھ روپے

تنخواہ ملتی ہے۔ جس سے بمشکل کنبے کا راشن پورا ہوتا ہے۔ اب کوئی کپڑا کہاں سے
پہنے، بچوں کو تعلیم کہاں سے دے۔ بڈھا باپ بیمار ہو جائے تو اس کی دواؤں کے
لئے پیسے کہاں سے آئیں۔ بیوی کے کانوں کے لئے بالیاں کہاں سے دستیاب
ہوں گی۔ آج کل خوشی کا بھاؤ اتنا بڑھ گیا ہے۔ کہ ساٹھ روپے پانے والا راجپوت،
خوشی کا ایک انچ۔ خوشی کا ایک ماشہ، خوشی کا ایک لمحہ بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔
یہی سوچ کر موہن سنگھ نے راجپوت ہو کر تلوار چھوڑ دی تھی۔ اور کوکین فروش
بن گیا تھا۔ کوکین فروشی میں روپے زیادہ ہیں۔ اور آخر آج کل کے بیشتر سیاست
داں کوکین فروشوں سے کیا کم ہیں۔ پچھلے زمانے میں بادشاہ اور وزیر اور سیاست
داں خود تلوار چلاتے تھے۔ اب تلوار چلانے میں پیسہ نہیں رہا۔ اس لئے کوکین
فروشی کرتے ہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے بھئی۔ اگر موہن سنگھ نے تلوار
چھوڑ کر کوکین فروشی شروع کر دی۔ میں کہتا ہوں، بڑا اچھا کیا۔

بادشاہ سلامت گرج کر پوچھتے ہیں۔ موہن سنگھ کیا لائے
باندرہ گیا تھا۔ ایک قصاب نے ساڑھے سات سو کی کوکین مول لے
لی۔ یہ ہے حضور کی خدمت میں،

حضور نے دو سو روپے اٹھا لئے
باقی لے جاؤ موہن سنگھ
شریف! کیا کرتے رہے تم آج
شریف بڑا بدمعاش تھا۔ در اصل وہ بدمعاش نہ تھا، لوگ بدمعاش تھے
جو اس سے عورتیں طلب کرتے تھے۔ شریف کا تو یہی کام تھا کہ وہ ان مردوں

کی طلب پوری کر دیتا تھا۔ ایک طرح ڈیپارٹمنٹ سٹور کا کام تھا اس کا۔ جہاں ہر طرح کا مال دستیاب ہوتا ہے۔ جیسے وائٹ وے بلیک لائیں ہر قسم کا سامان مل جاتا ہے۔ اسی طرح شریف کے ہاں ہر طرح کی عورت ملتی تھی۔ ہر رنگ اور نسل سے لے کر ہر عمر کی عورت۔ باب الہند کے قریب بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر وہ ہر روز ساڑھے پانچ بجے آن کھڑا ہوتا۔ سپید قمیص، سیاہ بوٹ اور سیاہ کوٹ پہن کر نکلتا۔ اور گاہک کو دیکھ کر آہستہ سے کہتا۔

پندرہ سولہ برس کا مال۔ نیا چھوکری۔ فرسٹ کلاس

ہات لگاؤ تو میلی کیسی چاہیے سیٹھ صاحب۔ مارواڑی۔ گجراتن۔ مراٹھن، پنجابن، کشمیرن مدراسن، راجپوتن، یعنی گویا کہ یہ صوبجاتی لعنت زنا میں بھی موجود تھی۔

اس پر بھی اگر کوئی گاہک ٹس سے مس نہ ہوتا، تو وہ اپنا آخری حربہ استعمال کرتا۔

یورپین مال لاؤں، انگریزی، فرانسیسی، پرتگیزی، ولندیزی، اطالوی، رومانوی، ٹرکش، پولش، جرمن، گٹ پٹ کرے، شراب پلائے، موٹر چلائے، سیٹھ کو مجا کرائے۔

یہاں پر لوگ چاروں شانے چت اوندھے گر پڑتے تھے۔

شریف کا پیشہ بڑا نیک تھا۔ یعنی کمیشن ایجنٹ کا۔ یا شیر بازار کے دلال کا۔ ایک آدمی حصہ خریدتا ہے۔ دوسرا بیچنا چاہتا ہے۔ دلال دونوں کو ملا دیتا ہے اور اپنا کمیشن کھرا کر لیتا ہے۔ آخر شریف بے چارہ اس سے اوپر اور کیا کام کرتا تھا۔ جو شیر بازار کے وہ بڑے بڑے دلال کرتے تھے جو شام کو اپنی بیش قیمت گاڑیوں میں بیٹھ کر تاج

آتے تھے۔ اور شریف سے لونڈیوں کا سودا کرتے تھے۔ لونڈیاں بھی حصوں کی طرح بکتی تھیں۔ اور خریدی جاتی تھیں۔ اور ان کے بھاؤ میں بھی چنگا مندا ہوتا رہتا تھا۔ کبھی ٹاٹا ڈیفرڈ کے بھاؤ بڑھ رہے ہیں۔ تو زہرہ کا بھاؤ بڑھ رہا ہے۔ کوہ نور کے حصوں کی قیمت گھٹ کر تین سو پچاس رہ گئی۔ تو رام پیاری کا ریٹ ڈھائی سو سے سو ہو گیا۔ اور مزا یہ ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سٹاک ایکسچینج اور چکلے کے بھاؤ یکساں تیزی مندی سے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ اور یہ مشاہدہ غلط بھی نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں بازاروں میں وہی سیاسی سماجی حادثے کارفرما ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں جب فرقے واریت زوروں پر تھی۔ تو ہر طرح کے حصے گر گئے تھے۔ انہی دنوں شریف کو بھی اپنے مال کی قیمت اسی شرح سے کم کرنی پڑی، پھر جب پہلے جنگ کا زمانہ تھا۔ اور بھاؤ اوپر جا رہے تھے۔ جب تو آٹھ روپے والی لونڈیا بھی ساٹھ روپے لیتی تھی، چنانچہ اسی صورت حال کو ملحوظ خاطر رکھ کر بہت سے دلال اپنا سودا شیئر بازار کی بجائے چکلے ہی میں کرتے ہیں۔ پوچھ لیں گے۔ زہرہ کا بھاؤ کیا ہے۔ تیزی پر ہے یا مندہ ہے۔ بس وہ بھی اسی بھاؤ پر شیئر بازار میں اپنا بھگتان کر لیں گے۔ زہرہ کا بھاؤ اونچا ہے تو وہ بھی کاٹن کا بھاؤ بڑھا دیں گے اور بھاؤ گر رہا ہے۔ تو وہ بھی سونا چاندی بیچنا شروع کر دیں گے۔ اور آخر تو ساری بات سونے چاندی کی ہے نا۔ چاہے وہ کوکین ہو یا عورت ہو یا ڈالمیا سیمنٹ ہو۔

خیر تو شریف نے جب اپنا نام سنا۔ تو تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلا "سرکار" اور پھر اس کی گھگھی بندھ گئی۔

بولتا کیوں نہیں۔ نطفۂ نمک حرام۔ بادشاہ سلامت نے برافروختہ ہو کر

کہا۔

حضور پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ آج دن بھر تھانے میں رہا۔

کس نے پکڑا تمھیں۔ بادشاہ سلامت نے درشتی سے پوچھا۔ پولیس نے پکڑ لیا تمھیں۔ میرے آدمی کو ...

سچ تو ہے۔ بادشاہ کے آدمی کو پولیس کیسے پکڑ سکتی ہے۔ حیرانی کی تو بات تھی۔

وہ حضور۔ ایک نیا سب انسپکٹر آیا ہے اہم کے تھانے میں، ناواقف تھا حضور۔ شریف بتیسی نکالتے ہوئے بولا۔ اب دوبارہ کچھ نہیں کہے گا حضور سب ٹھیک ہو جائے گا مائی باپ۔

"ہوں" بادشاہ سلامت مسکرائے۔ اور اسے اپنے پلے سے پچاس روپے دیتے ہوئے بولے۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی رات جوان ہے۔ چلا جا پون پل پر۔ کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ مل جائے گا۔

خدا سب کا رزاق ہے۔ وہ چور کو بھی روٹی دیتا ہے اور رہزن کو بھی، اور بردہ فروش کو بھی۔

اور پھر یکایک ان لوگوں کی نظر مجھ پر پڑی۔ بادشاہ سلامت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلا کر بولے۔

تو کون ہے۔ یہاں کیوں آیا ہے۔

چشم زدن میں بادشاہ سلامت کے حواریوں نے چاقو نکال لئے اور انھوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے کہا۔ میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں، سناتا ہوں
خود بھی سنتا ہوں۔ دوسروں کو بھی سناتا ہوں۔ یہاں کہانیاں ڈھونڈنے آیا
تھا۔ کیونکہ آج کل کہیں کہانیاں نہیں ملتیں۔ اور جو کہانیاں تھیں خوبصورت
تخیل کی۔ اور حسین رومانوں کی، اور جنتی پریوں کی، جہاں خواب جھلملاتے
اور قوس و قزح کی مسکراہٹیں بُنی جاتی ہیں۔ اور محبت کی شمعیں روشن ہوتی
ہیں۔ وہ کہانیاں اندھیرے میں ڈوب گئی ہیں۔ اور ان کے تخیل میں زہر مل گیا
ہے۔ اور ان کی خوبصورتی کو قتل کر کے قصابوں کے ہاں گوشت کی طرح بیچ
گیا ہے۔ اور میں اندھیرے میں ہوں۔ اور میں اجالا چاہتا ہوں۔ اور میں اداس ہوں
اور میں ہنسنا چاہتا ہوں۔ اور حقیقت کے اس قدر نزدیک ہوں کہ کہانی سننا چاہتا
ہوں۔ بادشاہ سلامت۔ آپ مجھے اپنی کہانی سنائیے۔ آپ سچ مچ اس عظیم الشان
اندھیرے کے بادشاہ ہیں۔ جو نسل انسانی پر صدیوں سے محیط ہے۔ آپ کا مقام
ان بادشاہوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جو تاج اور گرین میں مکلف لباس
پہنے آہستہ خرام پریوں کے ساتھ رقص کناں ہیں۔ یہ غلام کورنش بجالاتا ہے۔

بادشاہ سلامت میری قصیدہ خوانی سے بے حد محظوظ ہوئے۔ انھوں نے
ہات کے اشارے سے سب کو رخصت کر کے تخلیہ کر دیا۔ بجائے اس کے کہ
مجھ سے کچھ پوچھتے، میں نے ان سے پوچھنا شروع کر دیا۔

حضور کا نام

سلیمان

کہاں کے رہنے والے ہیں آپ

ابی سینیا کے

ملکۂ شیبا کے ملک سے آئے ہیں

ہوں

وہاں کیا کام کرتے تھے آپ

غلام تھا

غلام!

ہاں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میری زندگی کا تجربہ یہی کہتا ہے کہ گو انسان نے بظاہر غلامی کی رسم مٹا دی ہے۔ لیکن ابھی تک غلامی مٹی نہیں۔ وہ ابھی تک بیشتر ملکوں میں جاری ہے۔ انسان بدستور پیچھے جا رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ یہ تو کہانی نہ ہوئی۔ تقریر ہو گئی۔

سنو۔ سلیمان نے کہا۔ میں شاہی محل کا ایک ادنی غلام تھا۔ ابی سینیا میں آنے سے پہلے میں ٹانگا نیکا کے ایک حبشی سردار کا غلام تھا۔ ٹانگا نیکا سے بھاگ کے ابی سینیا آیا۔ پھر وہی غلام کا غلام رہا۔ جب اطالوی حبشی جنگ چھڑی تو میں نے غداری کی اور اطالویوں سے مل گیا۔

میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ بالکل بادشاہوں کی سی حرکت ہے

سلیمان نے کہا۔ میں اطالویوں سے مل گیا۔ ایک اطالوی کرنل مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ وہ مجھے روم لے آیا۔ روم میں میری شناسائی ایک سفید فام لڑکی سے ہوئی۔ لوگ مجھے قتل کرنے کو دوڑے۔ کیونکہ میں حبشی تھا۔ اور بدستور وہی غلام تھا۔ میں بھاگ کر چلا آیا۔ ایک دخانی جہاز میں نوکر ہو گیا نیپلز میں، وہ

جہاز ہندستان آرہا تھا۔ یہاں سیٹھ پھول چند کا ڈرائیور بن گیا۔ سیٹھ مجھ پر آج بھی اتنا اعتبار کرتے ہیں کہ اپنی بیوی پر بھی شاید اتنا اعتبار نہیں کرتے۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ سیٹھ کے کاروبار میں تمہارا کتنا حصہ ہے،

بادشاہ سلامت اچھل پڑے۔ ہائیں تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ سچ بتاؤ، جلدی بتاؤ۔

قیافہ حضور محض قیافہ

بادشاہ سلامت کا منہ اتر گیا۔ بولے، ساری محنت تو میں کرتا ہوں، وہ کمائی میں ستر فیصدی لے لیتا ہے۔

تیس فیصدی میں لیتا ہوں۔

بس ایک سوال اور پوچھونگا۔ میں نے کہا

بولو

آپ اپنے ساتھیوں سے کتوں کا سا سلوک کیوں کرتے ہیں۔

اس کے بغیر کوئی آدمی بادشاہ نہیں بن سکتا۔ بنیا نہیں بن سکتا، اگر میں ان سے کتوں کا سا سلوک نہ کروں تو یہ جھٹ مجھ سے برابری کی توقع کرنے لگیں۔ اور بادشاہت میں برابری کہاں۔ گو ہم میں سے کوئی خدا کا بیٹا نہیں ہے سبھی انسان کے بیٹے ہیں۔ پھر بھی مجھے بادشاہ بننے کے لئے ان سے کہنا پڑتا ہے کہ میں شاہ سلیمان کی اولاد میں سے ہوں۔ شاہ سلیمان اور ملکہ شیبا کی اولاد ہوں۔ تخت سلیمانی پر میرا حق ہے۔ سمجھ گئے ؟

میں نے کہا ــــ ہندستان خوش نصیب ہے، کہ اسے آپ ایسا

بادشاہ ملا - ہندستان میں بڑے بڑے پیغمبر آئے - اور بڑے بڑے بادشاہ۔ لیکن آپ کا مرتبہ سب سے بلند ہے - آپ تخت سلیمانی کیا سارے جہان کے تخت کے مالک ہیں - ہر تخت میں یہی خواص ہوتے ہیں - جو آپ کی بادشاہت میں ہیں - خدا آپ کے اقبال میں دن دونی رات چوگنی ترقی دے -

اتنا کہہ کر میں کورنش بجالایا - اور زانوئے ادب تہہ کرکے اٹھا - اور الٹے پاؤں گراج سے باہر نکل کر باب الہند کی طرف چلدیا -

باب الہند ویران پڑا تھا - اور سمندر کی لہریں بڑی بے صبری سے سڑک کے کنارے دیوار سے ٹکراتی تھیں، اور اپنا سر پھوڑ کر واپس ہو جاتی تھیں۔ سڑک کے کنارے تاج کے سامنے نئی گاڑیاں اپنے عفریتی دہانے کھولے کھڑی تھیں - جیسے ہیبت ناک دیوؤں کی قطاریں - میں سوچنے لگا - تخت، اور تختے میں کیا فرق ہے - دراصل کوئی فرق نہیں ہے - جو امیر کا تخت ہوتا ہے وہی غریب کا تختہ بن جاتا ہے - انسان ابھی تک کیوں بادشاہوں اور غلاموں میں بٹے ہوئے ہیں ؟ عجیب سے سوال میرے ذہن میں اٹھ رہے تھے - اور ذہن کو سمندر کی لہروں کی طرح کوئی راستہ نہ ملتا تھا - اور وہ مایوسی کے عالم میں دیواروں سے ٹکرا کر واپس ہو جاتا تھا - یکایک سامنے اوپر تاج کی روشنیاں اک دم گل ہو گئیں - اور آرکسٹرا عجب سے ختم ہو گیا - میں نے سوچا - کمرے دبوچ لی گئیں، بازو بھینچ گئے - ہونٹ غرق ہو گئے - شراب کی مہک عود کی طرح تاج کے اندھے مقبروں میں پھیل گئی ہے - اور بے جان ممیاں زندہ محبت کی تضحیک کر رہی

ہیں۔ اور انسان کہاں سو رہا ہے۔ اور سمندر اس قدر نزدیک ہو کر بھی اتنا بے بس اور مجبور کیوں ہے۔

چلتے چلتے میں تاج سے آگے ریڈیو کلب کی طرف نکل آیا۔ سمندر بدستور لہریں لے رہا تھا۔ اور برابر ساحل کی دیوار سے سر ٹکرا رہا تھا۔ میں نے مایوسی میں کہا ابھی کچھ نہ ہوگا۔ ابھی سمندر بہت دور ہے۔ بہت دور ہے۔

یکایک میرے قدم ڈگمگائے۔ اور میں گرتے گرتے بچا۔ میرا لباس پانی سے تر ہو گیا۔ یہ سمندر کی ایک بہت بڑی لہر تھی جو دور سے آئی تھی۔ اور گرجتی برستی شور مچاتی، ساحل کی دیوار کو پھلانگتی سڑک پر آن پہنچی۔ اور میرے کپڑے سے گیلے کر گئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو تاج کے سامنے ساری موٹریں پانی کی اچھال کی لپیٹ میں آ گئی تھیں۔ اور اب یہ لہر سمندر میں اچھلتی کودتی ہنستی کھیلتی واپس جا رہی تھی۔ اور اس کی ہنسی میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی انسانی فتح کا مغرور نغمہ سنا رہا ہو ٭٭

اپنے ہاں جو سلام بھائی رہتے ہیں نا، انھیں کوپن جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ مذہب کے بعد اگر ان کا ایمان کہیں ہے، تو کوپنوں میں، ابھی چند روز کا ذکر ہے۔ میں نے سلام بھائی کے ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ سگریٹ کی ڈبیا دیکھی۔ میں نے سوچا کہیں یہ کوپنوں کے شوق میں میں پراٹھوں کے ساتھ سگریٹ تو نہیں کھانے لگ پڑے۔ اس لئے ان سے فوراً ہی گھبرا کر پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے۔ ناشتے کی پلیٹ میں سگرٹ کی ڈبیا کیسی؟"

سلام بھائی نے ڈبیا کھولتے ہوئے کہا "یہ سگرٹ کی ڈبیا نہیں مکھن کی ڈبیا ہے"

بیسویں صدی میں صنعتی اشیا کی پیکنگ اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ کہ مکھن کی ڈبیا سگرٹ کی ڈبیا نظر آتی ہے۔ کھلونے بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں اور عورتیں بالکل مصنوعی، بلکہ اکثر تو ان پلاسٹک کی عورتوں میں جو وائٹ وے کی نمائشی کھڑکی میں ریان کی جرابیں پہنے نظر آتی ہیں ہماری اصلی چلتی پھرتی خواتین سے کہیں زیادہ زندگی اور جاذبیت نظر آتی ہے۔ کوپن بھی صنعتی دور کا اعجاز ہے۔ اور سلام بھائی اس کے بے حد قائل ہیں۔

میں نے سلام بھائی سے پوچھا "آپ ناشتے کے وقت ہر روز ایک نئی ڈبیا لاتے ہیں؟"

سلام بھائی بولے "میں اس کے کوپن جمع کر رہا ہوں"

"کوپن جمع کرکے کیا ہوگا؟"

سلام بھائی بولے "کوپنوں سے بہت سی اشیا مفت ملتی ہیں"

"مفت؟ نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"ہاں بالکل مفت، مثال کے طور پر اگر آپ کے پاس اس مکھن کی ڈبیا کے پانسو کوپن ہوں۔ تو آپ ایک ہری کین لالٹین حاصل کر سکتے ہیں"

"لالٹین لے کر میں کیا کرونگا؟ آجکل تو بجلی کا زمانہ ہے"

"اچھا لالٹین نہ سہی کچھ اور سہی۔ فہرست میں بہت سی اشیا کے نام ہیں۔"

"لالٹین ہے" سلام بھائی نے فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "سگرٹ جلانے کا چاندی کا لائٹر ہے۔ کوئی کا جوتا ہے۔ ریان کی جراب کوٹی روڈ کے دس ڈبے۔"

"میں کوئی کارڈز استعمال نہیں کرتا۔ گو کا بچوں میں اکثر یونڈے آج کل میک اپ کے اعتبار سے لڑکیوں سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں پھر بھی سلام بھائی یہ فضول خرچی ہے۔ آخر پانسو کوپن جمع کرنے میں تو روپیہ خرچ ہوتا ہے نا"

سلام بھائی بولے "آپ بھی تو غضب کرتے ہیں۔ مکھن تو روزمرہ کے استعمال کی شے ہے۔ آپ مکھن خریدتے ہیں۔ ساتھ میں ایک کوپن مفت ملتا ہے۔ پانسو کوپن اس طرح اکٹھے ہو جائیں۔ تو ہری کین لالٹین۔ ایک ہزار ہوں تو چاندی کی موٹھ والی چھڑی۔ دو ہزار ہوں تو پارکر کا فون ٹن پن۔ دس ہزار ہوں تو ریڈیو گرام۔ بولئے"

میں قائل ہو گیا۔ میں نے پوچھا "مکھن کی ایک ڈبیا جس میں کوپن ہوتا ہے کتنے میں آتی ہے؟"

"ساڑھے گیارہ آنے میں"

دوسرے روز میں نے بھی ڈبیا خریدی۔ مجھے ریڈیو گرام لینے کا شوق تھا۔ اس لئے میں نے دن میں چار بار یہ ڈبیا خریدنی شروع کی۔ مجھے مکھن پسند

نہیں رہا ہے۔ میں دراصل دہی پسند کرتا ہوں۔ مگر اب کیا کیا جائے مکھن خریدنا تھا۔ کیونکہ ریڈیو گرام لینا تھا۔ روز چار چھوٹے ڈبیا خریدتا۔ اور مکھن کھانے کی کوشش کرتا۔ اور اکثر ناکام رہتا۔ اس لئے کوپن اٹھا کر جیب میں ڈال لیتا۔ اور مکھن اٹھا کر سلام بھائی کو دے دیتا۔ اس پر وہ بہت ناک بھوں چڑھاتے۔ کہتے مکھن آپ رکھ لیجئے۔ کوپن ہمیں دے دیجئے۔ میں نے کہا۔ واہ مجھے تو ریڈیو گرام لینا ہے۔ اسی لئے تو مکھن کھا رہا ہوں۔ آپ بھی کھائیے۔ چنانچہ میں نے گھر میں زبردستی سب کو مکھن کھلانا شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں مکھن کی افراط سے مجھے پیچش ہو گئی۔ اور شفا ہوتے ہوتے ڈیڑھ سو روپے اٹھ گئے۔ اب تک میرے پاس دو سو کوپن جمع ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا ریڈیو گرام تو کہاں آئے گا۔ چلو ان دو کوپنوں کا جو مل جائے لے لیں۔ میں دو سو کوپن لے کر گیا۔ انھوں نے کہا۔ آپ ان اشیا میں سے کوئی ایک چیز اپنے لئے پسند کر لیں۔

اشیا یہ تھیں:۔

(۱) کاٹھ کا گھوڑا چھ سال کے بچے کی سواری کے لئے

(۲) بالوں کے پنوں کے تین سیٹ

(۳) لپ اسٹک

(۴) بالوں کو گھونگھریلے بنانے کا آلہ

(۵) پھلوں کا رس نکالنے کی مشین

(۶) آئس کریم کھانے کا خوشنما پلاسٹک چمچہ۔

پہلے تو سوچتا رہا۔ ان میں سے تو ایک چیز بھی اپنے کام کی نہیں۔ آخر آئس کریم کھانے پر جی آ گیا۔ میں نے پلاسٹک کا چمچہ اٹھا لیا۔ اور اطالوی رستوران میں آئس کریم کھانے چلا گیا۔ وہاں میں نے اس خوب صورت چمچے سے چھ پلیٹیں خوب ڈٹ کے کھائیں۔ لیکن جب بل ادا کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پلیٹ میں بل کے ساتھ ایک کوپن بھی دھرا ہے!

میں نے گھبرا کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

ویٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اپنے ہاں جو چھ پلیٹ آئس کریم اکدم کھائے اُسے ایک کوپن ملتا ہے"

"میں اس کوپن کو لے کر کیا کرونگا؟ نہ بابا۔ میں باز آیا۔ اٹھا لو یہ کوپن"

ویٹر نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا "آپ اسے لے جائیے یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ آپ کو تو مفت مل رہا ہے۔ آپ کسی دوست کو دے ڈالیئے گا۔ وہ ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا۔

"اجی صاحب" ویٹر نے ایک لمبی فہرست کھولتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کے پاس ایک درجن ایسے کوپن ہوں۔ تو ہم آپ کو گرینا گار بو کی فریم کردہ خوبصورت تصویر دیں گے"

"چوبیس کوپن ہوں تو بال اُگانے کی کریم"

"مگر میں تو گنجا نہیں ہوں"

"پچاس کوپن ہوں۔ تو بایو کیمسٹری کا ایک چرمی بیگ میں بند مکمل دواخانہ"

"کاہے کے لئے بھائی؟"
"بدہضمی دور کرنے کے لئے۔ ہر قسم کی بیماری کے علاج کے لئے"
"پانسو کوپن ہوں تو ایک دو سیٹ کی چھوٹی موٹر گاری Motor
کار"

"باپ رے!" میں اچھل پڑا "لاؤ۔ لاؤ۔ ادھر لاؤ۔ یہ کوپن"
کوپن لے کر اس دن کے بعد جو میں نے وہاں سے آئس کریم کھانی
شروع کی۔ تو دو مہینے ہی میں تین سو کوپن جمع کر لئے۔ اگلے ماہ پچاس اور
بڑھ گئے۔ لیکن اب مجھ سے آئس کریم کھائی نہ جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
میں آئس کریم نہیں کوپن کھا رہا ہوں۔ یا آنے والی Motor کار کے پرزے
چبا رہا ہوں۔ پھر پچاس کوپن اور بڑھ گئے۔ یہ کوپن بڑی مشکل سے کھائے
گئے۔ میرا مطلب ہے آئس کریم بڑی مشکل سے چبائی گئی۔ روز رات کو کھٹی
ڈکاریں آتیں۔ زکام ہو جاتا۔ دوست احباب بہتیرا سمجھاتے۔ مگر مجھ پر تو
ایک ہی دھن سوار تھی۔ کسی طرح پانسو کوپن پورے ہو جائیں۔ اور اب تو صرف
ایک سو کوپن باقی رہ گئے تھے۔ جب پانسو میں صرف پچیس کوپن باقی رہ گئے
تو شام کے وقت مجھے حرارت سی ہو گئی۔ رات کو میں بے ہوش ہو گیا۔ صبح کو
ملک عدم سدھار جاتا اگر عین وقت پر طبی امداد نہ طلب کی جاتی۔ معلوم ہوا
زیادہ آئس کریم کھانے سے میرے پھیپھڑوں کی جھلی میں ورم پڑ گیا ہے
دو مہینے علاج ہوتا رہا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ خرچ اٹھا۔ خیر جب اچھا ہوا تو کوپن اٹھا
کر دکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا۔ انعام یا تو چار سو کوپن پر ملتا ہے۔ یا پانسو کوپن پر۔

۴۷۵ کوپن پر کچھ نہیں ملے گا۔

"تو چار سو کوپن پر ہی کچھ دید یجئے"۔

"یہ دیکھئے فہرست"

میں نے دیکھی فہرست۔ آپ بھی دیکھ لیجئے۔

(۱) کوٹ ٹانگنے کی کھونٹیاں۔ چوبیں

(۲) سوٹ پریس کرنے کی مشین۔ دو

(۳) بجلی سے حجامت کرنے کی مشین۔ دو

(۴) ریان کی جرابیں چار عدد

(۵) مغربی عورت کے سر پہ پہننے کی ہیٹ

(۶) اونچی ایڑی کے سینڈل دو عدد

(۷) اصلی برائر کی لکڑی کا پائپ نقرئی پینڈل کے ساتھ

میں نے پوچھا "۴۷۵ کوپنوں میں موٹر کار نہیں دوگے؟"

"نہیں۔ وہ تو پانسو کوپنوں میں آتی ہے۔ آپ پچیس کوپن اور جمع کر لیجئے

اس میں ہے کیا"

"ہے کیا"، میں نے گرج کر کہا "میرے بھیپھڑوں کی جھلی پر ورم آگیا ہے۔
آئس کریم کھاتے کھاتے۔ اور تم پچیس کوپن کی رعائت نہ کرسکے"

"ہمیں بڑا افسوس ہے"

میں نے کہا "تم ان پچیس کوپنوں کے عوض میں اس کار کا ہڈ اتار لو۔ اس
کے آگے کی دو بتیاں غائب کر دو۔ یا ایک ٹائر پنکچر کر دو۔ اس کا اسٹیرنگ وھیل

توڑ دو۔ مگر للّٰہ مجھے وہ کار ضرور دے دو۔ یہ دیکھو میرے پھیپھڑوں میں ورم ہوگیا ہے تمھاری آئس کریم کھاتے کھاتے۔"

وہ انکار کرتا گیا۔

میں نے کہا "اگر تو پھر اس فہرست میں مجھے اپنے لئے اونچی ایڑی کا سینڈل چاہئے۔ مگر شرط یہ ہے کہ میرے پاؤں پر فٹ آئے"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ تمھیں فٹ کرنا ہوگا۔ نہیں تو مجھے ایک مغربی عورت کی ہیٹ دے دو۔ میں اُسے پہن کر تمھارے ریستوران کے سامنے ناچا کروں گا۔ اس علالت کے دوران میں میری نوکری بھی چھن گئی ہے مجھ سے، بھیک مانگ کے کھایا کرونگا"

وہ ہنسا "آپ بڑے زندہ دل آدمی معلوم ہوتے ہیں" اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ یہ برائر لکڑی کا پائپ لے جائیے۔ دیکھئے کس قدر خوشنما شے ہے"

"مگر میں تمباکو نہیں پیتا"

"آپ پی کے تو دیکھئے۔ اعصاب کے لئے بڑی عمدہ شے ہے"

"مگر تمباکو بھی تو دیجئے" میں نے پائپ لے کر کہا

"ہم تو صرف پائپ دیتے ہیں سوری!" وہ بولا "تمباکو آپ کسی تمباکو فروش سے لیجئے"

پائپ لے کر میں تمباکو فروش کی دکان پر پہنچا۔ وہاں سے ریٹا سکوئر

گئے۔ دو ڈبے خریدے۔ خوبصورت خوشبو دار مٹیا کو ہے۔ دس روپے میں دو ڈبے ملے۔ اور ساتھ میں ایک کوپن۔

"نہیں نہیں!" میں نے چلا کر کہا۔ "میں یہ کوپن نہیں لونگا۔ ابھی تو میرے پھیپھڑوں میں دم ہے۔ اب کیا چاہتے ہو کہ میری آنتیں بھی گل جائیں اللہ جانے یہ کوپنوں کی وبا کب ختم ہوگی"

دکان دار بولا "دو ڈبوں کے ساتھ ایک کوپن ملتا ہے۔ چار ڈبوں کے ساتھ تین کوپن۔ آٹھ ڈبوں کے ساتھ چھ کوپن۔ اور جب چھ کوپن سے اوپر ہو جائیں۔ تو ہماری انعامی فہرست شروع ہوتی ہے"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ چلا کے کہا "میں نہیں دیکھوں گا یہ فہرست"

دکاندار نے فہرست اونچی آواز میں پڑھ کے سنانی شروع کی۔ فرینچ موتیوں کی مالا۔ گولڈ فش رکھنے کا قیمتی حوض۔ اصلی کاریز کی گرم ٹوپی۔ چائے کا سیٹ کراؤن مارکہ، سامان برتھ کنٹرول اپ ٹو ڈیٹ۔ بال اڑانے کی کریم، شارک سکن کا مردانہ سوٹ، ریفریجیریٹر"

"ریفریجیریٹر؟" میں نے چونک کر آنکھیں کھولدیں۔ میرے امیر دوستوں کے ہاں کیسے خوبصورت ریفریجیریٹر ہیں۔ ہر چیز برف کی طرح ٹھنڈی ملتی ہے۔ شفاف اور خنک۔ گرمیوں میں کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا، "کتنے کوپنوں میں ملتا ہے؟" میری آواز کانپ

رہی تھی۔

"صرف پانچ ہزار کوپن ہیں"

"یعنی کتنا تمبا کو پینا پڑے گا مجھے؟"

"بیس ہزار ڈبے ایک سال میں خرید یئے۔ ایک سال کے بعد یہ کوپن بے کار ہو جاتے ہیں"

"بیس ہزار ڈبے۔ یعنی کتنا تمبا کو ہوا جی؟"

"دو ٹن"

"دو ٹن تمباکو پی کر آپ کا خیال ہے میں زندہ رہوں گا؟"

"کوشش کیجیے"

پھر وہ رک کر بولا" ایک صاحب پچھلے سال ہی ریفریجریٹر حاصل کر چکے ہیں"

وہ پھر رک کر افسردہ لہجے میں بولا۔

"ریفریجریٹر حاصل کرنے کے دوسرے روز وہ چل بسے نتھے منے سے تپ دق ہو گئی تھی۔ آہ بے چارہ! بڑا اچھا گاہک تھا ہمارا"

میں نے آہستہ سے کہا" یہ کوپن تم رکھ لو جی"

"یہ کوپن تو واپس نہیں ہو سکتا۔ مگر — ایک بات کہتا ہوں" دکاندار بولا" آپ اسے مان لیجئے، آپ چھ کوپن حاصل کر لیجئے۔ چھ کوپن میں ہم آپ کو نیو پلازا سینما کا ایک ٹکٹ دے دیتے ہیں۔ آپ پکچر دیکھنے جا سکے"

"مگر میرا آج کا پروگرام تو پکچر کا نہیں ہے۔ دوسرے اگر مجھے پکچر پسند

نہ آئی تو۔ یعنی میں پکچر تو دیکھنا ہی نہیں چاہتا آج "

" تو کیا مضائقہ ہے۔ آپ کے کون سے پیسے خرچ ہوں گے اس پر
مزے میں بیٹھ کے پکچر دیکھیئے۔ اچھا نہ دیکھئے۔ سیٹ پر سر رکھ کے آنکھیں
بند کر لیجئے اور آرام سے آہستہ آہستہ ناک کے نتھنوں سے ہمارے بہترین
تمباکو ریٹ سکویئر کا دھواں نکالئے۔ زندگی میں اس سے بہتر سکون کہیں نہیں
ملے گا "۔

سکون آرام۔ ذہنی تعیش کی کس قدر خوب صورت تصویر کھینچی ہے
ظالم نے۔ میں قائل ہوگیا۔ فوراً چھ کوپنوں کے لئے تمباکو کے ڈبے خرید لئے
اور پھر نیو پلازا کا ٹکٹ حاصل کر کے سینما پہنچ گیا۔

سینما کے دروازے پر فرسٹ کے درجے کے سامنے ایک باوردی
ملازم نے میرا ٹکٹ مجھ سے لیا۔ آدھا ٹکٹ اپنے پاس رکھ لیا۔ اور آدھا مجھے
واپس کر دیا۔ اور ساتھ ہی ایک کوپن دیا ... !

" ہائیں ! " میں فرش سے دو فٹ اوپر اچھلا " یہاں بھی کوپن ہے
یا اللہ۔ یہ کیا مصیبت ہے "

باوردی ملازم مسکرایا۔ اور اس نے آہستہ سے سامنے دیوار پر ایک
بڑے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

" نہیں نہیں۔ میں نہیں دیکھوں گا اب چاہے کچھ ہو جائے "

وہ بولا " اس سے بہتر فہرست آپ کو ہمارے ملک کی کسی انڈسٹری
میں نہیں ملے گی۔ یہاں کوپنوں کے عوض بوسے ملتے ہیں "

پنچروالے کی بیوہ!"

"ارے جب تو کروڑوں کی مالک ہے وہ!"

"آپ جانیے، اُسے پیسوں کی کیا کمی۔ اس نے ایک سال کے لئے ساتھ والا سینما بک کرایا ہے تاکہ سارے کوپن خود حاصل کر کے جلد سے جلد اشلوک کمار کا بوسہ لے سکے۔ اسی طرح کئی ایک بڑے بڑے مارواڑی اور گجراتی سٹے بازوں نے سینما ہاؤس چھ چھ مہینے کے لئے بک کر لئے ہیں۔ اور دھڑا دھڑ کوپن حاصل کر رہے ہیں۔ کوئی کسی اداکار کے لئے۔ کوئی کسی کے لئے۔"

"جب تو خوب سلور اور گولڈن جوبلیاں منائی جاتی ہوں گی"؟

"کچھ نہ پوچھئے۔ بس ہاؤس فل ہیں۔ فل جا رہے ہیں۔ فل جائیں گے عجب زندگی ہے۔"

میں نے پوچھا: "اچھا زیادہ تر تو یہ لوگ بے بی کرگس۔ مس پھریا، یا مس جینچارا کے کوپن حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے؟"

"نہیں صاحب۔"

"ارے! نہیں کیوں؟ میرا تو خیال ہے ... ..."

"آپ کا خیال غلط ہے" وہ بولا: "آج کل مس مصیبتا دیوی اور کوکیلا رانی بڑا ارسشن سے رہی ہیں"

"وہ کیوں؟ میرے خیال میں ان کا زمانہ تو لد چکا۔ اور پھر اس فہرست میں" میں نے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ان کا نام بھی

کہیں نہیں ہے ،،

،، اسی لئے تو وہ بوسوں کے علاوہ کوپن بھی خود اپنے پاس سے دیتی ہیں ؟،،

،، کوپن اپنے پاس سے دیتی ہیں! کیا کہتے ہو تم ؟ ،،

،، ہاں اور یار لوگ دھڑا دھڑ کوپن حاصل کر رہے ہیں تاکہ ــــ ،،

،، تاکہ ،، میں نے اکدم خوش ہو کے کہا ،، ایک لاکھ کوپن اکٹھے ہو جائیں تو مس چیتریا ــــ ،،

،، اور دو لاکھ ہو جائیں ،، اس نے جواب دیا ،، تو بے بی گرگس ... اسی لئے تو صاحب وہاں پر نائی دھوبی، کنجڑا، اور آپ ایسا بے کار فلمی ادیب بھاگم بھاگ ... ،،

میں نے مٹھیاں کس لیں اور بھاگنا شروع کیا ۔

،، کہاں جا رہے ہیں آپ ؟ فرسٹ کلاس ادھر ہے ۔ ارے کہاں جا رہے ہیں آپ ؟ ،،

،، کوکیلا رانی کے پاس ،، میں نے بھاگتے بھاگتے جواب دیا ۔ اور سینما ہال کے باہر نکل گیا ۔

ہندستان کے اس صنعتی دور میں اب تو سب کچھ کوپن سے ملنے لگا ہے خدا ، محبوب ، نوکری ، شہرت ، گھر ، سب کچھ کوپن سے ملتا ہے ۔ اور نہیں کہیں ملتا ہے تو پیٹرول کا کوپن ۔ شرافت کی طرح وہ ہر جگہ نایاب ہوتا جا رہا ہے ۔

پچھڑواسے کی بیوہ ! "

" ارے جب نوکر شہروں کی مالک ہے وہ ! "

" آپ جانیئے۔ آسے پیسوں کی کیا کمی۔ اس نے ایک سال کے لئے ساتھ والا سینما بک کرا لیا ہے تاکہ سارے کوپن خود حاصل کر کے جلد سے جلد اشلوک کمار کا بوسہ لے سکے۔ اسی طرح کئی ایک بڑے بڑے مارواڑی اور گجراتی سٹے بازوں نے سینما ہاؤس چھ چھ ہفتے کے لئے بک کر لئے ہیں۔ اور دھڑا دھڑ کوپن حاصل کر رہے ہیں۔ کوئی کسی اداکار کے لئے۔ کوئی کسی کے لئے۔"

" جب تو خوب سلور اور گولڈن جوبلیاں منائی جاتی ہوں گی "؟

" کچھ نہ پوچھئے۔ بس ہاؤس فل ہیں۔ فل جا رہے ہیں۔ فل جائیں گے عجب زندگی ہے "

میں نے پوچھا " اچھا زیادہ تر تو یہ لوگ بے بی گرگس۔ مس پھریا، یا مس چنچارا کے کوپن حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے ؟ "

" نہیں صاحب "

" ارے! نہیں کیوں ؟ میرا تو خیال ہے ... ... "

" آپ کا خیال غلط ہے " وہ بولا " آج کل مس مصیبتا دیوی اور کریلا رانی بڑا ارشش لے رہی ہیں "

" وہ کیوں ؟ میرے خیال میں ان کا زمانہ تو لد چکا۔ اور پھر اس فہرست میں " میں نے نوٹس بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " ان کا نام بھی

کہیں نہیں ہے ۔"

"اسی لئے تو وہ بوسوں کے علاوہ کوپن بھی خود اپنے پاس سے دیتی ہیں"

"کوپن اپنے پاس سے دیتی ہیں! کیا کہتے ہو تم ؟"

"ہاں اور یار لوگ دھڑا دھڑ کوپن حاصل کر رہے ہیں تاکہ ——"

"تاکہ" میں نے اکدم خوش ہو کے کہا "ایک لاکھ کوپن اکٹھے ہو جائیں تو مس پچھتیا ——"

"اور دو لاکھ ہو جائیں" اس نے جواب دیا "تو بے بی کرگس ...
اسی لئے تو صاحب وہاں پرنانی دھوبی، کیجرٹا، اور آپ ایسا بے کار فلمی ادیب بھاگم بھاگ ... "

میں نے مٹھیاں کس لیں اور بھاگنا شروع کیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ ؟ فرسٹ کلاس ادھر ہے۔ ارے کہاں جا رہے ہیں آپ ؟"

"کوکیلا رانی کے پاس" میں نے بھاگتے بھاگتے جواب دیا۔ اور سینما ہال کے باہر نکل گیا۔

ہندستان کے اس صنعتی دور میں اب تو سب کچھ کوپن سے ملنے لگا ہے خدا، محبوب، نوکری، شہرت، گھر، سب کچھ کوپن سے ملتا ہے۔ اور نہیں کہیں ملتا ہے تو پٹرول کا کوپن۔ شرافت کی طرح وہ ہر جگہ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

زہر جو رُوح میں ہے

آج دفتر میں اچانک تعطیل ہوگئی، مسرت کا یہ عالم تھا کہ مہتمم صاحب سے یہ پوچھنا بھی یاد نہ رہا کہ یہ چھٹی کیوں ملی، کیسے ملی، کس لئے ملی، بس یہ یاد رہا کہ آج تعطیل ہے، اور آج کا دن دفتر کا نہیں ہمارا ہے، ہائے اس زندگی میں سچ مچ کتنے کم دن ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے ہوتے ہیں، ورنہ حیات تو مسلسل قید وبند کی کیفیت کا نام ہے۔ جب ہم بچے تھے ماں باپ کی قید میں تھے۔ وہ چاہتے تھے یہ کرو، وہ نہ کرو، یہ پہنو وہ نہ پہنو، اور ہم چاہتے تھے کچھ بھی نہ کریں، کچھ بھی نہ پہنیں، جب ذرا بڑے ہوئے تو اسکول کے جیل خانے میں بند کردیئے گئے۔ اس جیل خانہ کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہاں پر ایک چپراسی ہر وقت کھڑا

رہتا تھا، اور اس دروازے کے باہر اُجلا اُجلا دن تھا، صاف چمکدار دھوپ
تھی، لیکن اسکول کے کمروں کے اندر تو قیدی رہتے تھے، جو اُجلے دن اور
چمکدار دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے بجائے کالی تختیوں پر ٹیڑھے
میڑھے حروف لکھتے اور استادوں سے بید کی مار کھاتے تھے۔ دن میں ایک
بار سہ پہر کے وقت اس جیلخانہ کا دروازہ کھلتا تھا، جب وہ چھٹی کا گھنٹہ بجتا
... وہ چھٹی کا گھنٹہ! ابھی تک کانوں میں اس کی مسرت زا گونج سنائی
دیتی ہے، آج جب مہتمم صاحب نے چھٹی کی فرحت ناک خبر سنائی، معلوم ہوا
پھر وہی چھٹی کا گھنٹہ بج اٹھا اور اس کی خوش آیند آواز، یاد کی اندھیری غلام گردش
میں بجلی کی طرح چمکتی ہوئی دوڑ گئی ... کمبخت اسکول بھی تو ایک
اندھیری غلام گردش سے کم نہ تھا، استادوں کے بڑے بڑے پیکر، خشونت
کے بھیانک مظہر، وہ بھورے رنگ کے چمکدار بید، وہی ڈسک اور وہی
بنچ اور سہمی سہمی نگاہیں اور سکڑے سکڑے جسم، بیٹھے ہیں۔ متوحش نگاہوں سے
استاد کے بدلتے ہوئے حلیے کو دیکھ رہے ہیں، جو اس وقت الف لیلیٰ کا آدم
خور دیو معلوم ہوتا ہے، دراصل بچوں کے ڈر میں ان کے چھوٹے قد کا بھی حصہ
ہوتا ہے۔ خوف ہو یا مسرت ان کا منحنی قد ڈر یا خوشی میں اسی ہیبت کا اضافہ
کرتا ہے، کیونکہ اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے وہ دنیا کو ایک زیریں زاویہ سے
دیکھنے پر مجبور ہیں ... اس زاویہ سے چنبیلی کی ایک چھوٹی سی جھاڑی
بھی گویا کس قدر بڑی نظر آتی ہے، پھولوں سے بھری پری، رشک گلزار کھیل
کے میدان میں ناپنے جاؤ تو آسمان وسیع و عریض، زمین لامتناہی سبزہ

بے پناہ اور درختوں کی چوٹیاں اس قدر بلند نظر آتی ہیں کہ دل [illegible]
ان پر اڑنے، پھیلنے اور تیرنے کے دھندلے دھندلے شعور اور جذبات سے
معمور ہو کر ایک عجیب خوشی سے ہمکنار ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اس خوشی میں درد کی
شدت اس قدر واضح ہوتی ہے کہ دل ہمک ہمک کر بار بار حلق میں آنا چاہتا
ہے، جتنا درد اس بچپن کی مسرت میں ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ بچپن کے خوف
میں بھی محسوس ہوتا ہے، وہی استاد جو کالج کے زمانے میں بے ضرر، گاؤدی
بلکہ یتیم سے معلوم ہوتے ہیں اسکول میں ماں باپ، اندھیرے اور خدا سے بڑھ کر
ہیبت ناک معلوم ہوتے ہیں، ان کا لہجہ خوفناک، ان کی مونچھیں خوفناک، حتیٰ
کہ ان کے پچکارنے کا انداز بھی خوفناک معلوم ہوتا ہے - اور یہ صرف اس لئے کہ
بچے اپنے قد کی وجہ سے زندگی کو ایک زیریں زاویئے سے دیکھنے پر مجبور ہیں جب
ان کا قد تین چار فٹ اور بڑھ جاتا ہے تو ان کا خوف بھی اسی نسبت سے دور
ہو جاتا ہے، اگر انسان بھی درختوں کی طرح لمبے ہوتے تو نہ جانے کتنے علو ہمت
ہوتے، لیکن شاید یہ سچ نہیں ہے کیونکہ اگر زیریں زاویہ سچائی کو اس کے صحیح تناسب
سے بڑا کر کے دکھاتا ہے تو بالائی زاویہ اُسے کم کر کے دکھاتا ہے، حسن تناسب
ہمیں ان دونوں حدوں کے بیچ میں ہے، زندگی کا مرکزی نقطہ جہاں ہر زاویہ
اپنی صحیح حالت میں منعکس ہوتا ہے، آج کل یہ مرکزی نقطہ کہیں نہیں ملتا، اسی
لئے تو سچائی چھوٹی بڑی، ٹیڑھی میڑھی ہوتی جا رہی ہے -

الف لیلہ میں ایک اندھے آدم خور دیو کی کہانی ہے جو ایک تاریک
غار میں رہتا اور اپنے غار کے اندر انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح قید رکھتا تھا

مگر خود ہمیشہ غار کے دروازے پر سوتا تاکہ کوئی انسانی بھیڑ اُسے جُل دے کر فرار نہ ہو جائے۔ بچپن میں جب کبھی میں نے اس کہانی کو پڑھا مجھے اپنے اسکول کا تاریک غار یاد آیا۔ اسکول میں بھی ایک ہی دروازہ تھا۔ ہاں دیو بے شمار تھے، ایک سے ایک بڑھ کر خوفناک۔ مجھے یاد ہے ان دنوں الف لیلہ کی اسی کہانی کو پڑھتے ہوئے میں اپنے آپ کو انسانی بھیڑ بکریوں کی طرح بے یار و مددگار محسوس کرتا۔ میں غار کو اسکول سمجھتا، دیو کو استاد، غار کے قیدیوں کی جگہ طالب علم دیکھتا، اور پھر میں تصور میں اسی آہنی سلاخ کو آگ پر سرخ کرنے لگتا جو تھوڑی دیر میں اس خوفناک دیو کی اندھی آنکھوں کو جلانے والی تھی، اس سرخ سلاخ کو میں نے ہمیشہ اپنے انتقام کی آگ پر روشن دیکھا ہے اور اب بھی دیکھتا ہوں کہ زندگی میں دیوؤں کی قوم ہی نہیں استادوں سے لیکر دفتروں کے مہتمم تک اس آگ کو مشتعل کرتے رہتے ہیں! زیریں زاویہ نگاہ ... ...

بہت سے انسان ساری عمر بچے رہتے ہیں اپنے دھن میں، اپنے تخیل میں۔

پھر یہ ڈیسک اور کرسی کا معاملہ اس قدر عجیب ہے۔ جب میں تین سال کا تھا تو مجھے کھانے کی میز پر اپنے گھر کے دیگر افراد کے ساتھ بیٹھنا پڑتا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں آپا کی شفقت بھری گود سے محروم ہو کر اس اونچی سی کرسی پر بیٹھتا تو ایسا محسوس کرتا تھا گویا فضا میں معلق کر دیا گیا ہوں اوپر سے نیچے کہیں نہیں ہوں، بس یہ ایک اونچی سی کرسی تھی جس کی دو باہیں تھیں، تاکہ میں اس کرسی پر اچھی طرح جکڑا رہوں، یہ زندگی کے مہتمم "جکڑنے" کے فلسفہ کے بہت قائل معلوم ہوتے ہیں۔ ماں باپ کو دیکھئے، بچپن میں بیٹھنے کے لئے ایک

اونچی سی کرسی دیتے ہیں، سامنے ایک میز لگا دیتے ہیں اور اس طرح بچے کو اچھی طرح جکڑ کر اپنی دانست میں گویا تمام ارضی و سماوی آفات سے محفوظ کر لیتے ہیں، بچہ جب اسکول جاتا ہے تو وہاں بھی اُسے بنچ اور ڈیسک اور کالج میں بھی وہی ڈیسک اور کرسی کی قید و بند سے سابقہ ہوتا ہے۔ میز اور کرسی انھیں دو بنیادی اصولوں پر زندگی کا اندھا کولھو چلتا ہے اور اب تو امریکہ میں موت کی سزا بھی کرسی پر بیٹھا کر دی جاتی ہے ... ... سوچتا ہوں جب تک دنیا میں کرسی کا وجود ہے موت ہمیشہ زندگی پر غالب رہے گی۔

اسی لئے تو آج جب مہتمم صاحب نے چھٹی کی خبر سنائی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا موت پر غلبہ پاکر اندھے دیو کے تاریک غار سے نکل آیا ہوں اسی وقت بغل میں فائل کا پلندہ داب کر دفتر سے نکلا اور گھر کی طرف سرپٹ بھاگا کہ کہیں تعطیل منسوخ نہ ہو جائے لیکن عین راستے میں جامن والی نے روک لیا، یہ جامن والی میرے دفتر کی غربی دیوار کے آخری سرے پر جامن کے پرانے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مونگ پھلی، جامن، کیلے، آم اور اپنی عصمت کا بیوپار کیا کرتی ہے، میں آج اس قدر خوش تھا کہ اس سے باتیں کئے بغیر، مسکرائے بغیر اور اس سے کچھ خریدے بغیر ہی سرپٹ بھاگا جا رہا تھا، اس کو میری یہ روش خلاف معمول معلوم ہوئی اور اس کی نگاہوں سے شعلے اور لبوں سے شکایت ٹپکتے دیکھ کر مجھے مجبوراً رکنا پڑا، میں نے دیکھا کہ اس کے سانولے چہرے پر سرخی کی جھلک نمایاں ہے اور اوپر کے ہونٹ کے مسے پر پسینہ کی دو ایک بوندیں کانپ رہی ہیں، وہ اس وقت ایک قرمزی شعلہ معلوم ہوتی تھی چلئے! میں کو زوق ہی،

آپ کو سرخ شعلہ پسند ہے، مجھے قرمزی، سیب کی صباحت تو صرف کشمیر میں ملتی ہے ورنہ میرے ہندستان کا رنگ تو جامنی ہے، اور میں آپ کی طرح چھوٹا تو نہیں آخر آپ جو کبھی اپنے کالے کلوٹے محبوب کھترے محبوب کو اپنی گفتگو میں معرکا بت بناتے ہیں، تو کیا واقعی خیال کرتے ہیں کہ آپ کے احباب آپ سے اس قدر ناواقف ہیں ؟ گالی دینے لگے، مگر یہ تو کوئی گالی نہیں، مجھے واقعی عریانی پسند ہے۔ خصوصاً آپ کو اس حال میں دیکھ کر تو بہت ہی لطف اٹھاتا ہوں، عریانی! —

——— مادر ——— زاد! ———

جامن والی نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ہے بابو!

میں نے وہیں دور کھڑے ہو کر کہا۔ ہو جامن والی!

وہ بولی۔ اکڑی اے

میں نے ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کر کے کہا۔ نہیں میں اُدھر جاتا ہوں آج!

وہ بولی۔ ۔۔نکڑے ؟

میں نے جل کر کہا۔ اکڑے، نکڑے، اِدھر بھی اور اُدھر بھی۔

وہ کچھ نہ سمجھ سکی، بولی، ماجھی جامبو جانگی! میری جامن اچھی ہے، ..

... اور یہ کہہ کر پٹ پٹ آنکھیں چمکانے لگی، یہ ادا اس کی پٹینٹ تھی جو کبھی خفا نہ کرتی تھی، میں اس کے قریب آگیا اور لگا سمجھانے کہ سن اے میری جامن والی، آج میں تیری جامنیں نہیں کھاؤں گا، ان پلپلے پھلوں کے سبکٹے ذائقے سے طبیعت اکتا چکی ہے، آج میں دھوپ کھانا چاہتا ہوں اور کھلی ہوا

جس میں لیمو بلیک روشنائی کی بو نہ ہو، آج اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا چاہتا ہوں،
جہاں پیشواؤں کا پرانا مندر اور قلعہ ہے۔ پاربتی ہل! اس کی بلندی سے
مغلوں اور مرہٹوں کو مصروف پیکار دیکھوں گا۔ یہ سنسان وادی اس تازہ تازہ
خون کی ابلتی ہوئی روانی سے سرسبز ہو جائے گی، کوہستان تلواروں کی جھنکار
سے جاگ اٹھیں گے اور مدت کے سوئے ہوئے علاقے نعرہ ہائے جنگ
کی آواز سے بیدار ہو جائیں گے ــــ زندگی کا یہ تابناک منظر کرسی کی نشست
پر کہاں مل سکتا ہے۔ چل! میرے ساتھ۔ رات کی رانی! ہم قلعہ کی دیوار سے
جامنوں اور مونگ پھلیوں سے بھری ہوئی ٹوکری کو نیچے ڈھکا دیں گے، اور
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس کلہ کوہ کی طرف اپنی آنکھیں جما دیں گے جہاں
شفق کی سرخیاں سورج کا خون اچھالتی اور دھرتی اس کے آتشیں ظلم سے
آزاد ہو کر اطمینان کا سانس لیتی ہے اور چاندنی کی خنک آغوش میں کھو جاتی ہے

یکایک جامن والی بولی۔ "ایہہ جامو سرس .... ایہہ چانگلا،
خاک! میں نے غصے سے کہا ایہہ جامن سرس نائیں۔ ایہہ جامن
چانگلا نائیں (جامن اچھی نہیں)

اور وہاں سے اٹھ کر میں تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف ہو لیا، پرانے
جامن کے پیڑ سے دس بارہ قدم آگے ایک ٹوٹی سی پلیا کی تاریک محراب کے
نیچے سبز پانی چمک رہا تھا، جھاڑیوں میں دو آدمی بیٹھے ہوئے پرانے جامن کے
پیڑ کی طرف بے قراری سے دیکھ رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی انھوں نے نگاہیں
نیچی کر لیں، میں نے سوچا یہ ہماری سرکار ٹوٹی پلیا کے نیچے گندے پانی میں پیدا

ہونے والے ملیریائی مچھروں کے مارنے کا کوئی انتظام نہیں کرتی، پھر خیال آیا عقلمند ! تجھے اس سے پہلے یہ خیال نہیں آیا کیا عسلامی ملیریائی مچھر سے کم غلیظ ہے ؟ مگر دوسرے ہی لمحہ میں خیال یوں گم ہو گیا جیسے پیدا ہی نہیں ہوا تھا، آج بلاشبہ ندی کی روانی تیز تھی، حباب سطح آب پر ٹھہر نہیں سکتے تھے ، تعطیل کا دن تھا، اور میں زمین پر نہیں آسمانوں پر اُڑا جا رہا تھا۔

× × × × ×

گھر پہنچا تو نوکر نے دوپہر کا کھانا چن دیا، وہ یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آج تعطیل ہے ۔ کھانا کھا کر اس نے سینما جانے کی اجازت مانگی ، میٹنی شو۔ میں نے اسے سینما کے ٹکٹ کے پیسے دیدیئے اور وہ خوشی خوشی "جادو کا ڈنڈا" دیکھنے کے لئے چلا گیا، دفتر میں تو تعطیل تھی۔ لیکن نوکر کے جانے کے بعد گھر میں بھی تعطیل ہو گئی اور میں بالکل ہی اکیلا رہ گیا، چند منٹ تک سونے کی کوشش کی، خوب پاؤں پسارے ہوئے بستر پر لیٹا رہا، الٹا، سیدھا، آڑا، ترچھا اوندھا، لیکن آنکھوں میں نیند کہاں، پھر سیٹی بجا بجا کر فائل دیکھنے، مگر وہ کہنے لگے آج تعطیل ہے، آج جاں بخشی کرو۔ مطالبہ معقول تھا۔ میں نے انھیں میز پر پٹک دیا اور ایک انگڑائی لے کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا، سامنے ایک خوبصورت آنکھوں، سپید دانتوں اور موٹے گالوں والی حسینہ رہتی تھی، سانولا رنگ، سرو قد اور شمشاد کی طرح نازک ، اس حسینہ سے کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں عشق کیا کرتا تھا، کیونکہ یہ مشغلہ بیکاری میں محبوب ترین بن جاتا ہے، حالانکہ بہت سے لوگ برج کھیلتے یا پتنگ اڑاتے ہیں۔ خیر یہ اپنا اپنا مذاق ہے ۔

یہ حسینہ گود میں ایک بچہ لے کر کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی تھی، چونکہ وہ کسی رقص کے مدرسہ میں تربیت حاصل کر رہی تھی اس لئے ہماری گفتگو اکثر کتھا کلی میں ہوا کرتی، ہاں کبھی کبھی جب بچہ اُسے بیحد پریشان کرتا تو منی پوری میں رقص کرتی اور مجھے اس کے جواب میں تانڈو نرت سے کام لینا پڑتا لیکن نتیجہ آخر میں یہی ہوتا کہ وہ بچہ کو چھاتی سے چمٹا کر مسکرا کر، گردن ہلا کر اور آنکھوں سے برہ کا بھاؤ بتا کر رخصت ہو جاتی اور میں سگریٹ باہر پھینک کر کھڑکی بند کر دیتا۔ تو آج بھی وہ مجھے نظر آئی، بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے لیکن مجھے دیکھتے ہی اکدم حیران سی ہو گئی میں نے دیکھا کہ آج اس کی آنکھوں میں کاجل گہرا ہے اور دنبالے کا تیر کنپٹی تک پہنچ آیا ہے۔

بھاؤ بتا کر کہنے لگی۔ آج تم بہت جلد آ گئے

میں نے اشارے سے کہا۔ آج چھٹی ہے۔ ڈارلنگ!

چھٹی ہے ... تو آج دن بھر اپنے گھر میں اکیلے کیا کرو گے؟

کھڑکی سے تمہاری صورت دیکھتا رہوں گا ... بشرطیکہ تمہاری ماں نہ آ جائے۔ مجھے ان سے ڈر ... ...

ہٹو جی، میری ماں کو کچھ مت کہو

اس کی گود کا بچہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پھر میری طرف ہات بڑھا کر کہنے لگا۔ بو، بو، بو۔

میں نے کہا۔ یہ تمہارا بھائی بکرے کی طرح کیوں ممیاتا ہے۔ اسے اپنی گود سے الگ کر دیں یک وقت بھائی بہن دونوں سے عشق نہیں

کر سکتا۔

وہ ہنس کر کہنے لگی ۔ آج چھٹی کیوں ہو گئی ؟

جانے بلا۔ میں نے تانڈو نرت میں سے ایک مشہور مدرا مستعار لیکر کہا : آج تم چلو ہمارے ساتھ ، جادو کا ڈنڈا دیکھو، مزے کا کھیل ہے۔ گیارہ گانے، پچیس شعبدے اور ہیرو ہیروئن کے چابک مار کر پریم جتاتا ہے، یہ ماجرا بھی دیکھنا۔

اگر ہماری تمھاری شادی ہو جائے تو کیا تم بھی اسی طرح پریم جتاؤ گے؟ اس نے پوچھا

تم کتنی بھولی ہو میری جان! شادی سے پہلے چابک ہیرو کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور شادی کے بعد ہیروئن کے ہات میں کمبخت فلم والے یہ تو کبھی دکھاتے ہی نہیں۔ شادی کے بعد۔

ہاں ہماری تمھاری شادی کے بعد

میں نے کہا۔ دیکھو میں تمھیں کئی بار سمجھا چکا ہوں، ہمارا تمھارا سیدھا سادہ عشق ہے، اس میں شادی کو دخل نہیں تم نے پھر کبھی شادی بیادی کا نام لیا تو میں نے کھڑکی بند کر دی ۔

جاؤ مرو۔

وہ روٹھ کر چلی گئی، لیکن میں اس کے کھلائے ہوئے نینوں میں آنسوؤں کو جھلملاتے دیکھ چکا تھا، اس لئے مسکرا کر چپ ہو رہا ۔

آئے گی، آئے گی، ایک دن ضرور آئے گی، لیکن اب کیا کروں ؟

کھڑکی سے ہٹ کر چاروں طرف نظر دوڑائی، سیر؟ اونہونہہ! کتابیں؟ اونہہ! خطوں کے جواب؟ نہیں۔ جاذو کا ڈنڈا دیکھنے چلو گے؟ وہی تو ایک فلم ہے جو تم نے ابھی تک نہیں دیکھی۔ اونہونہہ! تو پھر کیا کروگے؟ جب تعطیل ہوتی ہے تب بھی مردوں کی طرح بے کار ہو جاتے ہو۔ چلو اٹھو، برآمدے میں چلو۔ کم از کم راستہ چلنے والوں کی صورتیں ہی نظر آجائیں گی، اور میں اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔

ایک چھکڑا گزرا، اس میں کھالیں بھری ہوئی تھیں، خوشبو سے دل و دماغ دونوں معطر ہوگئے۔ پھر ایک بھنگی سڑک پر سے گوبر اٹھانے لگا، اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی، دایاں بازو مڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے گوبر اٹھا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے جامن کھا رہا تھا، پھر یکایک جھک کر اپنی پھٹی ہوئی دھوتی سے تن ڈھانپنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔

دو کتے ایک بکری اور اس کے دو بکروٹوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے آئے۔ بکری اپنے بکروٹوں کو بچاتی ہوئی سیدھی دروازے کے اندر ہوئی اور برآمدے میں آکر رک گئی، کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی کتوں کی طرف، پھر اپنا اگلا بایاں پاؤں بار بار اٹھا کر زمین پر مارتی اور زور سے کہتی۔ نخ! نخ! نخ!

میں نے آرام کرسی خالی کرتے ہوئے کہا۔ اے شہزادی بلخ! تخت حاضر ہے، تشریف لائیے۔ غلام ابھی کتوں کی گوشمالی کرتا ہے۔

میں نے کتوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا، اور وہ بیچارے اپنا سا منہ لیکر چلے گئے، اس وقت بالکل پٹے ہوئے بچوں کی طرح معصوم دکھائی دے

رہے تھے۔ بکروٹے ممنا کر پیشاب کرنے اور مینگنیاں بکھیرنے لگے۔

میں نے آزردہ ہو کر کہا: اے گلعذار پریزاد! کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے؟

بکری نے پاؤں زمین پر مار کر کہا۔ نخ! نخ!

٭ ٭ ٭

وہ اپنے بکروٹوں کو لے کر چلی گئی ... دور ... کہیں بہت دور ... میں پھر اکیلا رہ گیا۔

اور اس خالی رہ گذر کی طرف تکنے لگا۔

ایک خوش پوش نوجوان گذرا، میرے دروازے کے قریب کھڑا ہو کر سگار سلگانے لگا۔ پھر جیب سے رومال نکال کر بوٹ صاف کرنے والا تھا کہ ہماری نگاہیں دوچار ہوئیں اور وہ گھبرا کر رک گیا۔ اور رومال جیب میں رکھ کر جلدی جلدی ٹائی کی پھانسی درست کرتے ہوئے نئے مجرم کی طرح ادھر اُدھر دیکھتا ہوا چلا گیا۔

میرا پڑوسی باپٹ ایک نئی کار سے اترا۔ اس نے ریس میں سے چالیس ہزار روپیہ جیتا تھا۔

دروازے پر ایک طرحدار عورت نے ہات پھیلا کر کہا: بابو جی یہ خط پڑھ دیجئے،

میں نے کہا، چلی جاؤ،

وہ قریب آکر مسکرائی اور کہنے لگی۔ کیوں؟

میں نے کہا۔ دیکھو، جب میں کالج میں پڑھتا تھا، اُن دنوں تم میرے پاس آئی تھیں کیونکہ بیکانیر میں قحط پڑا تھا اور تمھارا خاوند بیکانیر میں قحط کا شکار ہوا تھا یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے، پھر ۱۹۳۷ء میں تم اڑیسہ سے آئیں کیونکہ اڑیسہ میں تمھارے خاوند نے بھوک سے دم توڑ دیا تھا۔ پھر ۱۹۳۸ء میں تم غربی پنجاب سے تشریف لائیں کیونکہ تمھارے خاوند نے جو اک کسان تھا بارش نہ ہونے کی وجہ سے اپنی زمین فروخت کر ڈالی تھی۔ اب ۱۹۴۴ء میں تم غالباً بنگال سے آرہی ہو، دکھاؤ تو یہ چٹھی! میری جان! یہ سینڈل پہن کر بھیک مانگنا تم نے کس سے سیکھا ہے؟

لیکن اس نے وہ خط مجھ سے نہیں پڑھوایا، بلکہ شہزادی بلخ کی طرح پاؤں زمین پر مار کر چلی گئی۔ اور میں پھر اکیلا رہ گیا۔

اک گائے نے آکر باڑے کے پتوں کو چھوا۔

ایک ڈنڈا اس کی پیٹھ پر آکر پڑا اور ساتھ ہی چرواہے نے ایک موٹی سی گالی بکی۔ ایک ہات چرواہے کے کان تک گیا، یہ ایک تلک دھاری برہمن کا ہات تھا، یہ برہمن گائے کو سونٹا مارنے کے خلاف اپنی مرتعش آواز میں صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔

گائے بھاگی۔ چرواہا بھاگا۔ برہمن بکتا جھکتا بھاگا۔

سڑک پر ایک شخص اسکیٹنگ کی مشق کرتا ہوا گذر گیا۔

دو چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی محراب کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا " یہ پھول تھوڑے سے

توڑلیں؟،

ادھیڑ عمر کی عورتیں گذریں، لڑکیوں کو پھول توڑتے دیکھ کر وہ بھی رک گئیں۔ پہلے تو کچھ گھبرائیں، پھر شرمائیں، پھر گھگھیائیں۔ جی یہ پھول؟

میں نے کہا: توڑ لو۔

زیادہ ادھیڑ عمر کی عورت بولی۔ وہ —— ذرا —— پنجتارے کے پھول ... ...

توڑ لو، پنجتارے (اب کیا ہو سکتا ہے)

چلتے چلتے بھی ان عورتوں نے باڑھ کے کئی سبز چکنے پتے توڑ کر اپنے جوڑے میں اڑس لئے۔

میں نے کہا۔ یہ —— حنا کا گملہ بچ گیا ہے لگے ہاتھوں اسے بھی لیتی جائیے۔ اگر وہ شمالی ہند کی عورتیں ہوتیں تو شاید میرے لہجہ کی مظلومیت سے واقف ہو جاتیں، لیکن وہ تھیں مرہٹہ۔ اردو نہیں جانتی تھیں، اور میرے چہرے پر فیاضی کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھ سکیں۔ چنانچہ کمال مسرت سے حنا کے گملے کو اٹھا کر اپنے ساتھ لیتی گئیں۔

میں نے خدا سے دعا مانگی، اے خدا اب کسی ایسی حسینہ کو بھیج دے جو چنبیلی کے پھولوں کی ساری محراب، اس باڑے کے تمام پتے اور پنجتارے کے بوٹے کو جڑ سے اکھاڑ کر اپنے بالوں میں اٹکا لے، اور میں ہمیشہ کے لئے اس باغیچہ کی خدمت سے نجات پا جاؤں۔

چھوٹی لڑکیاں پھول توڑتے توڑتے گانے لگیں ... اب

میں نے جانا ہے پریم کیا ہے ... سوجا راجکماری ... چل چل رے نوجوان ... ہم کو بنا ؤ گوری ... اب تیرے سوا ... تیرے سوا ... اب تیرے سوا۔

گھبرا کر جلدی سے میں نے دروازہ مقفل کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

ؔ ؔ ؔ

گھر سے نکل کر چند قدم تو بالکل بلا مقصد ہی چلا گیا۔ یعنی اس وقت گھر سے نکل بھاگنے کے سوا اور کوئی فوری مقصد سامنے نہ تھا۔ لیکن جب چلتے چلتے سلور جبلی بس کمپنی کے کھمبے تک پہنچ گیا تو ذہن کی کیچڑ میں پھر وہی خیال کلبلانے لگا ... کہاں جاتے ہو؟ آج تعطیل ہے! آج چھٹی ہے، آج مسرت و شادمانی کا دن ہے۔ آج غلام کرسی سے آزاد ہوا ہے، وہ آج کیا ان خوبصورت لمحات کو یونہی گذر جانے دے گا۔ کیا وہ آج زندگی کی لذتوں سے بھرپور گھڑیوں میں نہیں کھیلے گا، کیا وہ اس دلفریب موسم میں، اس دلکش شہر میں، اس دل نواز ساعت میں، اس منحوس سڑک پر چلتا جائے گا۔ جس کے دونوں طرف آم جامن، تاڑ اور گلگر ونڈے کے پیڑ ہیں اور کلرکوں کے گھر ہیں اور کوڑے کرکٹ کے انبار ہیں اور گڑھوں میں پانی ٹھہرا ہوا ہے اور اس راہی کا انتظار کر رہا ہے جو آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے ٹھوکر کھا کر اس میں جا گرے ... یاں یہی وہ سڑک ہے جس میں دن رات مکھیاں بھن بھناتی اور مچھر گیت گاتے ہیں، یہی وہ سڑک ہے جو شہر کو ملیریا اور ڈاکٹروں کو روزی عطا کرتی ہے، اس سڑک پر کرسی کا غلام پنواڑیوں، بنیوں، سبزی فروشوں کی دوکانوں کو دیکھتا ہوا

چلا جا رہا ہے۔ بے مقصد، بے شعور، بے راہ، بے زار، یہ خوبصورت لمحے، یہ سندر موہنے، سجیلے پل یونہی ضائع ہو جائیں گے؟ آج چھٹی ہے۔ تعطیل کا دن تو مسرت، خوشی اور شادمانی کا دن ہونا چاہیئے۔ ایسا دن جو موت کے آخری لمحوں میں بھی ایک سنہری علم کی طرح چمکتا رہے اور موت کی افسردہ نگاہوں کو بھی اپنے قہقہوں سے خیرہ خیرہ کر جائے۔

میں نے تہیہ کیا آج کا دن ایسا ہی ہوگا، میں آج کے دن ہر پل میں ہر لحظے میں۔ ہر لمحے میں خوشی ٹھونس ٹھونس کر بھر دوں گا۔ جس طرح لوگ بوریوں میں گیہوں بھرتے ہیں۔ ٹھوس، جامد، وزنی مسرت جو زندگی کے آخری لمحوں تک میرے ساتھ جائے گی۔ جسے میں اپنے ذہن کے گودام میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لوں گا اور مستقبل کے المناک دنوں میں کھول کھول کر کھایا کروں گا۔ کہ دوراندیشی یہی ہے، روپیہ پس انداز نہیں کر سکتا تو اپنی مسرت کا ایک حصہ تو مستقبل کے لئے بچا بچا کر جمع کرتا رہوں۔

تو میں نے سوچا ——— پہلے میں بازار جاؤں گا اور بازار کے چوک کے سینما میں "جادو کا ڈنڈا" دیکھوں گا۔ اس کے بعد ——— اس کے بعد بازار کی سیر کروں گا ——— پھر دہی بڑے کی چاٹ کھاؤں گا ... پھر ریڈیو ہوٹل پہنچ کر شامی کباب خریدوں گا ... اور شامی کباب لے کر ناڑی والے کی دوکان پر جاؤں گا۔ جو ڈفرن برج کے نیچے واقع ہے۔ پھر گرین ہوٹل میں ڈنر کھا کر پیشواؤں کے قلعے کے اونچے کنگروں پر چڑھ کر وادی پونا کے دلفریب مناظر دیکھوں گا۔ پھر ... پھر گھر آ کر ... تکیے پر سر رکھ کر سو جاؤں گا ...

ہتے ... پروگرام تیار ہوگیا۔ اور شاداں و فرحاں بازار کی سمت چلا۔ چال میں ذرا سا فوجی انداز پیدا ہوگیا اور کانوں میں خوشی کا بینڈ بجنے لگا۔ ڈرم۔ ڈرم ڈرا۔ رارا۔ ڈرم رارا۔ ڈرم، ڈرم! ...

جو راستہ تلک روڈ سے بازار کو جاتا ہے وہ لکڑی پل سے گزرتا ہے، لکڑی پل کے نیچے ایک نالہ بہہ رہا ہے اور حد نظر تک بہتا ہوا نظر آرہا ہے دور دور یہ مندر ہیں اور شہر کے مکانات۔ ایک طرف شمشان میں چتا جل رہی ہے اور دوسری طرف قبرستان میں گورکن مصروف کار نظر آتے ہیں۔ دھوبی کپڑوں کو پتھروں پر پٹک رہے ہیں۔ بس کے کھمبے کے نیچے ایک گداگر سینہ کوبی میں مصروف ہے اور نہایت خوش الحانی سے کہہ رہا ہے۔ کوئی نہ دیوے دانہ مجھ کو۔ ہائے ہائے۔ کوئی نہ دیوے دانہ مجھ کو ہائے ہائے! آرٹسٹ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آواز میں ترنم اور سینہ کوبی میں تال ہے، اور اس طرح اس گداگر کی آواز اس کی سینہ کوبی سے مل کر ایک ایسی خوبصورت صوتی آہنگ پیش کرتی ہے جس کی مثال مشرقی موسیقی میں نہیں مل سکتی ... کوئی نہ دیوے دانہ مجھ کو ہائے ہائے ... میں اسے ایک آنہ دیتا ہوں، جو ایک جھنکار کے ساتھ اس کی ہتھیلی میں جا گرتا ہے اور وہ اپنی اندھی انگلیوں سے اسے ٹٹولنے لگتا ہے۔ آہنگ چند ساعتوں کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر وہی دلکش صدا ... کوئی نہ دیوے دانہ مجھ کو ہائے ہائے! ...

مرہٹی وضع کی نوگزی ساڑھیاں پہنے ہوئے عورتیں قم قم لگائے، بالوں میں پھول سجائے ساڑھی کا ایک پلو ہات میں لئے خراماں چلی جا

U168

رہی ہیں، لبوں پر تبسم ہے، لباس میں خوشبو ہے۔ لکڑی کے پل کا ریشہ ریشہ طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہک اٹھا ہے، ہر جوڑے میں پھولوں کی قوس اک الٹا ہلال معلوم ہوتی ہے۔

ایک لڑکی جس کی چوٹی میں صرف ایک سرخ پھول ہے۔ اپنی ایک سہیلی سے جس نے بنفشی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی ہے کہہ رہی ہے۔ پوپٹ جی مہاراج دھرپد بہت اچھا گاتے ہیں۔

پر مجھے تو دھرپد نہیں خیال پسند ہے۔

اونہہ! خیال تو مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

میں ایک سگریٹ سلگا لیتا ہوں تاکہ گلے کی تلخی کم ہو جائے۔

ایک بڈھا جس نے نافتی رنگ کی ٹوپی پہن رکھی ہے، اپنی دھوتی کی لانگ ٹھیک کرتے ہوئے ایک کھلی مہری والے پاجامے سے کہہ رہا ہے "ہم مہاراشٹر کے لوگوں کو گورنمنٹ میں بہت کم ملازمت ملتی ہے"

ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ کھلی مہری والے پاجامے نے کہا۔ سرکار شمالی ہند کے لوگوں کو زیادہ چاہتی ہے۔ ہم دکشنی لوگ ... ...

پاپس ... ہاپس ... رتناگری ہاپس

خوانچے والا رتناگری کے معروف آم بیچ رہا تھا۔

ہم دکشنی لوگوں کا کلچر سب سے اعلیٰ ہے، ایک ادھیڑ عمر کا دفتری غلام اپنی قمیص سے ناک صاف کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ اس کا سر گنجا ہے سپید مونچھیں موٹے موٹے ہونٹوں کے کونوں تک میں گھس گئی ہیں جس طرح پیپل

کی جڑیں دیوار میں ہلکی سی دراز بھی پاکر اندر گھس جاتی ہیں۔

دکشنی کلچر کا دنیا میں کہیں جواب نہیں۔ اُس کا ساتھی جواب دیتا ہے ... یہ شمال کے لوگ کلچر کیا جانیں کس چڑیا کا نام ہے ... ماس کھاتے ہیں۔ سالے ماس! اور چھوت چھات بالکل نہیں کرتے ... بڑے غلیظ ہوتے ہیں! یہ کہہ کر اُس نے زور سے سڑک پر تھوک دیا۔

یکایک میری زبان کٹ گئی۔ میں اس کو تسکین دینے کی خاطر تالو اور گالوں کی نرم نرم جھلی پر پھیرنا شروع کرتا ہوں۔

جلتے ہوئے سگریٹ نے میری انگلی کو کاٹ کھایا۔ میں نے جلدی سے اُسے پھینک دیا۔ وہ ہوا میں لہراتا ہوا ندی کی طرف جا رہا ہے۔

لالہ گھسیٹا رام

سانده کلاں ضلع لاہور کے نیک دل آڑھتی لالہ گھسیٹا رام کو کون نہیں جانتا۔ آپ سانده کلاں کے رئیس اعظم ہیں۔ سارا گاؤں آپ کا مقروض ہے۔ گاؤں کے سارے مکان آپ کے ہاں گروی پڑے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کا سارا زیور آپ کے ہاں رہن ہے۔ اس پر آپ کی شرافت کا یہ حال ہے کہ آج تک کبھی بھولے سے کسی مقروض کی قرقی نہیں ہونے دی۔ اگر وہ سود نہیں دے سکا تو آپ نے سود نہیں لیا۔ انتظار کرتے کرتے کئی سال بیت گئے مگر آپ نے سود نہیں لیا۔ الٹا اپنے پاس سے کچھ اور روپے دے کر اسے کاروبار پر لگایا۔ اس طرح سینکڑوں لوگ آپ کی دنیا دلی

سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اگر کسی نے جھگڑا بھی کیا تو آپ نے ہمیشہ طرح دی اور بات کو ٹال گئے۔ اگر معاملہ عدالت تک پہنچا تو آپ نے باول ناخواستہ اس کے خلاف ڈگری لے لی۔ لیکن اس کی تعمیل کبھی نہیں کرائی۔ لالہ گھسیٹا رام کو ہمیشہ عدالت سے ڈگری مل جاتی تھی۔ کیونکہ عدالت بھی جانتی تھی کہ لالہ گھسیٹا رام معاملے کا سچا ہے۔

لالہ گھسیٹا رام کے مزاج میں رواداری گھٹی میں پڑی ہے۔ سانده کلاں میں ہندو کم ہیں۔ مسلمان زیادہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے کھوٹے کرموں کی وجہ سے ہمیشہ ہندوؤں سے زیادہ مقروض زیادہ ضرورت مند زیادہ پریشان حال دیکھے گئے۔ لالہ گھسیٹا رام اپنے گاؤں کے سارے مسلمانوں کو جانتے ہیں۔ اور اُن سے بڑی ملاطفت اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ لالہ گھسیٹا رام کے منھ سے کبھی کسی مسلمان نے کڑوے بول نہیں سُنے۔ بلکہ بہت سے ہندو تو یہ کہتے سنے گئے کہ لالہ گھسیٹا رام ہمیشہ مسلمانوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ گو اس بات میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ کیونکہ لالہ گھسیٹا رام راسخ العقیدہ ہندوستانی ہیں۔ وہ ہر روز پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ اپنے گھر میں انھوں نے مندر تعمیر کرا رکھا ہے۔ اس میں روز صبح و شام دو گھنٹے بیٹھتے ہیں اور اپنے معبود کو یاد کرتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے بڑی رواداری برتتے ہیں۔ ابھی پچھلے سال انھوں نے مسجد کے لئے چندہ دیا تھا۔ اور جتے موچی کا انتقال ہوا تھا اور اس کی جوان بیٹی اکیلی رہ گئی تھی تو اس کی حفاظت بھی لالہ گھسیٹا رام ہی نے کی تھی اور خود اپنے ہاتوں اُس کی شادی سانده خورد کے ایک شریف نیک چلن موچی سے کر دی تھی۔ لالہ گھسیٹا رام کبھی کبھی اس جوڑے کو دیکھنے کے لئے سانده خورد جایا کرتے اور اس لڑکی کی ہتیلی پر دو چار روپے دھر آتے۔ سانده خورد کا مسلمان نمبردار بھی لالہ گھسیٹا رام کا

مقروض تھا۔ اور ہمیشہ لالہ کی شرافت کا ذکر نہایت ہی سنہری الفاظ میں بیان کرتا تھا۔

لالہ گھسیٹا رام کی دو بیویاں مر چکی تھیں ان سے چھ سات لڑکے بالے تھے جو اب جوان ہو چکے تھے۔ پھر لالہ گھسیٹا رام نے تیسری شادی کی تھی۔ اور اپنی سفید مونچھوں پر خضاب لگایا تھا۔ مونچھوں پر اور سر کے بالوں میں اور وہ اکثر ساندہ کلاں کے حکیم محمد وارث علوی سے دوا لیکے کھاتے رہتے تھے۔ اس عمر میں بھی ان کا رنگ تانبے کی طرح چمکتا تھا اور وہ صبح و شام چار چھ میل پیدل سیر کرنے جاتے۔ سیر کے اوقات میں وہ اکثر گاؤں کے مغربی کنوئیں پر ضرور ٹھہرتے اور گھڑی دو گھڑی اپنے گاؤں کی بہو بیٹیوں اور ماؤں سے بات چیت کر کے اُن سے ان کے گھر کے حالات پوچھتے اور ان کی تکالیف میں حصہ بٹاتے۔ لالہ گھسیٹا رام کی ذات پر گاؤں کی عورتوں کو بڑا اعتقاد تھا کہ وہ اکثر دکان پر آکے یا راستے ہی میں انھیں آتے جاتے دیکھ کر ان کا راستہ روک لیتیں اور ان سے نجی معاملات میں مشورے کی طلب گار ہوتیں۔ تین شادیاں کر کے لالہ گھسیٹا رام گھر کے معاملات پر بڑی قدرت حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے اُن کے مشورے عورتیں بڑی خوشی سے قبول کرتی تھیں۔ کئی گھرانوں کے برسوں کے پرانے جھگڑے لالہ گھسیٹا رام نے اس خوش اسلوبی سے طے کر دیئے کہ دن رات لوگ ان کا جس گاتے تھے۔

لالہ گھسیٹا رام دسہرہ اور عید بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے اور دونوں تقریبوں پر مٹھائی بانٹتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کو چندہ دیتے تھے اور کانگرس کو بھی۔ سرکاری وار فنڈ میں بھی انھوں نے ایک معقول رقم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کی معرفت بھیجی تھی۔ جس کے صلے میں انھیں سرکار عالی نے رائے صاحب کا خطاب عنایت فرمایا

اس موقعہ پر سانده کلاں کے ہر فرد نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اور گاؤں کی عورتوں نے خوشی سے ڈھولے گائے تھے۔ اور سانده خورد کے میراثیوں اور بھانڈوں نے جو لالہ گھسیٹا رام کے مقروض تھے۔ گاؤں والوں کو مفت تماشا دکھایا تھا۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی جب سانده کلاں میں لوکل بورڈ بنا تو لالہ گھسیٹا رام متفقہ رائے سے اس کے صدر مقرر ہوئے تھوڑے دنوں میں لوکل بورڈ اور پنچایتی کمیٹی اور کواپریٹو بنک میں ہر شخص لالہ گھسیٹا رام کے گن گانے لگا۔ کواپریٹو بنک تو ایک طرح سے لالہ گھسیٹا رام کا نجی بنک ہو گیا۔ کیونکہ اس میں سب سے زیادہ حصص لالہ گھسیٹا رام کے تھے۔ دوسرے گاؤں والوں کو ایک دوسرے پر اتنا اعتماد نہیں تھا۔ جتنا لالہ گھسیٹا رام پر۔ تھوڑے ہی دنوں میں لالہ گھسیٹا رام کی شہرت سانده کلاں اور سانده خورد سے آگے بڑھ کر ضلع جدو کے میں پہنچ گئی۔ اس ضلع میں روئی کی فصل بہت اچھی ہوتی تھی۔ اور شیخ عمر علی اور لالہ پرمانند اس کا بھگتان کرتے تھے مگر اب ضلع جدو کے بھی لالہ گھسیٹا رام کے گن گانے لگا۔ یہاں لالہ نے آڑھت کی ایک دکان کھول دی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں گاؤں والے جو اس سے پہلے شیخ عمر علی اور لالہ پرمانند کے مقروض تھے لالہ گھسیٹا رام کے مقروض ہو گئے۔ ان لوگوں میں خود شیخ عمر علی اور لالہ پرمانند بھی بہت جلد شامل ہو گئے۔

پندرہ اگست کے بعد لالہ گھسیٹا رام نے سانده کلاں چھوڑ دیا۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح اب کے بھی بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ وہ ان معدودے چند لوگوں میں تھے جنھوں نے بڑھتے ہوئے طوفان کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ضلع ہوشیار پور میں ایک چھوٹے سے قصبے سدارنگ میں آڑھت کی ایک دوکان

کھول لی تھی۔ اور جالندھر کے ایک بینک میں اپنا کھاتہ بھیج دیا تھا۔ اور اپنی تینوں بیویوں کے زیور اور سرکاری تمسک اور جنگی قرضے کی رسیدیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں پر ان کے پاس لوگوں کے گروی رکھے ہوئے زیورات اور دوسرے کاغذات اور پچاس ہزار روپے کی رقم ہی باقی رہ گئی تھی۔ جب لالہ گھسیٹا رام سانده کلاں چھوڑنے لگے تو انھیں گاؤں والوں نے روروکے روکا۔ مگر وہ نہیں رکے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے سارے زیور اور اُن کے کاغذات عورتوں کو ایک ایک کر کے گن گن کے واپس کر دیئے اور نوٹوں کی گڈیوں کو اپنے تہمد کی لپیٹ میں چھپا لیا۔ دکان انھوں نے شیخ عمر علی کے حوالے کی اور اس سے حصہ داری بھی کر لی۔ اور پھر انھوں نے سانده کلاں چھوڑ دیا۔ کیونکہ ان کے دوست پولس انسپکٹر صاحب خان نے انھیں سانده کلاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ وہ پولس کی ایک لاری میں سانده کلاں سے رخصت ہوئے اور امرتسر بحفاظت پہنچا دیئے گئے۔

سدارنگ کے قصبے میں پہونچ کر انھوں نے اپنے پچاس ہزار کے نوٹ گن لئے اور ان میں سے تیس ہزار روپے سے انھوں نے سدارنگ میں ایک بہت بڑی حویلی خرید لی، جو قصبے سے ذرا دور باہر کھیتوں میں تھی۔ اور کسی زمانے میں سدارنگ کے ایک بہت بڑے زمیندار کی ملکیت تھی۔ بہت جلد انھوں نے قصبے میں اپنا رسوخ جما لیا۔ ان کی آڑھت کی دکان چمک گئی۔ کیونکہ غلہ بہت مہنگا ہو رہا تھا۔ اور مغربی پنجاب سے شرنارتھی لاکھوں کی تعداد میں چلے آ رہے تھے اور مشرقی پنجاب سے شرنارتھی یعنی مہاجرین یعنی پناہ گزین مسلمان لاکھوں کی تعداد میں پاکستان بھاگے جا رہے تھے۔ اس موقعہ پر لالہ گھسیٹا رام نے شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں کی

کافی مدد کی انھوں نے قصبہ میں ایک سیوا دل قائم کیا جو آنے والے ہندوؤں اور جانے والے مسلمان دکھیاروں کی دیکھ بھال میں بڑے زور و شور سے حصہ لیتا تھا۔ بہت جلد علاقے میں لالہ گھسیٹا رام کا نام روشن ہو گیا۔ اور لوگ انھیں اور ان کے جان و مال کو دعائیں دینے لگے۔ علاقے کے بہت سے لوگ جوق در جوق آ کے اُن کے پاس اپنا قیمتی سامان گروی رکھنے لگے۔ اور مکان رہن رکھنے لگے۔ اور اس طرح خوشی خوشی مقروض ہوتے گئے۔ سرکار نے انھیں یہاں دو دکانیں الاٹ کر دیں اور ایک مکان بھی رہنے کو دیا۔ جہاں انھوں نے اپنے سیوا دل کا دفتر قائم کر دیا۔ کیونکہ خود تو وہ اس بڑی حویلی میں رہتے تھے جو قصبے سے کچھ دور باہر کھیتوں میں واقع تھی۔ علاقے کے افسر آنے جانے لالہ گھسیٹا رام کے ہاں ٹھہرتے اور ان کی آؤ بھگت ان کی سوجھ بوجھ اور عقل و دانش کی بے حد تعریف کرتے۔ کئی لوگ تو تعریف میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ کہنے لگے کہ لالہ گھسیٹا رام کو تو منسٹر ہونا چاہیے تھا۔ یہ سن کر لالہ گھسیٹا رام بڑی عاجزی سے مسکرانے لگتے۔

۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو یعنی پندرہ اگست سے تین ماہ پانچ دن بعد لالہ گھسیٹا رام کی حویلی پر پاکستان پولس کے ایما پر چھاپا مارا گیا۔ اور پولس نے تین مسلم مغویہ لڑکیاں برآمد کیں۔ لڑکیوں کے بیان کے مطابق لالہ گھسیٹا رام ان سے کوئی بُرا سلوک نہ کرتے تھے۔ وہ صرف لڑکیوں کی آڑھت کرتے تھے۔ وہ مسلمان لڑکیاں سستے داموں خریدتے اور مہنگے داموں بیچ دیتے۔ نرخ یہ تھا۔

چودہ سے سولہ برس کی لڑکی ۷۵۰ سے ایک ہزار روپے تک

سولہ سے پچیس برس کی لڑکی ۳۰۰ سے پانسو تک

میٹرک پاس لڑکی ، ڈیڑھ ہزار روپے

کالج کی پڑھی ہوئی لڑکی ، دو ہزار روپے

لڑکیوں کے بیان کے مطابق وہ اب تک سینکڑوں لڑکیوں کا بھگتان کر چکے تھے۔ اب ان مغویہ لڑکیوں میں ایک سانذہ کلاں کی لڑکی بھی تھی جو مشرقی پنجاب میں بیاہی گئی تھی۔ اُسے لالہ گھسیٹا رام نے خوب پیٹا تھا اس کی عصمت دری کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ دو ہزار تو ے سنا سانذہ کلاں کی عورتوں کو واپس کر کے آئے ہیں جب تک وہ اس کی قیمت وصول نہ کرلیں گے۔ وہ اسی طرح مسلمان لڑکیاں خریدتے اور بیچتے رہیں گے۔

چھ ماہ بعد لالہ گھسیٹا رام کو عدالت نے بری کر دیا۔ پتہ چلا کہ بدمعاشوں نے دھوکے سے لڑکیاں ان کی حویلی میں داخل کر کے پولیس کو اطلاع کر دی تھی، لالہ گھسیٹا رام باعزت بری ہو گئے۔ ان کی آڑھت کی دوکان پہلے سے بھی زیادہ چلتی ہے۔ حکام اعلیٰ ان کی عزت پہلے سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ ان کی حویلی کے باہر گورکھے پہرہ دیتے ہیں اور کبھی کبھی آدھی رات کے وقت وہاں سے چیخوں کی صدا بلند ہوتی ہے۔ جسے سن کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان رو رہا ہے۔ کچھ لوگ سوچتے ہیں ہندوستان رو رہا ہے۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان رو رہا ہے نہ ہندوستان، اس حویلی میں انسان رو رہا ہے۔ اور یہ حویلی سرحد کے آر پار دونوں طرف کھڑی ہے۔

سے مرتب کرائے گی۔ اُس وقت ضرور ی طور پر شری گوپال کرشن گو کھلے مرحوم کی خدمات سونے کے حروف میں لکھی جائیں گی۔ اور اگر سونا مہنگا ہوا تو چاندی کے حروف میں لکھی جائیں گی۔ بہرحال یہ خدمات ایسی نہیں ہیں کہ معمولی کالے حرفوں میں لکھی جائیں۔ آنجہانی گو کھلے بڑے خوش بیان مقرر تھے۔ امپیریل کونسل میں ان کی تقریریں سن کر خود وائسرائے، حضور وائسرائے تک جھوم جاتے تھے۔ گو کھلے مہاراج، مہاتما گاندھی جی کے گورو تھے، گویا نئی ہندی سیاست کے بانی، اور اس طرح سے آزادئ ہند کے پیش رو بھی وہی تھے۔ میرے ذہن میں جب کبھی گوپال کرشن گوکھلے کا نام آتا ہے۔ تو سارے جسم میں پھریری سی آجاتی ہے۔ اور روح اہتزاز کرنے لگتی ہے۔

اس وقت میں مرحوم کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں، کہ یہ کہانی گو کھلے مرحوم کے بت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ جو بمبئی میں چرچ گیٹ کے قریب سنٹرل ٹیلی گراف آفس کے قریب ایستادہ ہے۔ اُس روز سولہ اگست کی تاریخ تھی۔ یعنی یوم آزادی کی تقریب کے دوسرے روز ہی شام کے وقت میں گھومتا ہوا آیا۔ اور دیر تک آنجہانی گو کھلے کے بت کو فرطِ محبت تکتا رہا دیر تک۔ احترام اور تقدس سے دل امڈنے لگا اور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ آج گو کھلے مرحوم کی روح کتنی خوش ہوگی۔ وہ سپنا جو انھوں نے اپنے تخیل میں دیکھا تھا۔ آج ہماری نگاہوں کے سامنے حقیقت بن چکا تھا۔ آج ہندستان کے عوام آزاد تھے۔ ان کی صدیوں کی بھوک

غائب ہو چکی تھی۔ اور جہالت کافور۔ اب یہ کھیت اُن کے تھے۔ یہ کارخانے ان کے۔ اور اس ملک کا سارا دھن دولت ان کا تھا۔ وہ اپنے گھر کے مالک تھے۔ آزادی کی لڑائی جیتی جا چکی تھی۔ اور آج ہماری آزادی کا دوسرا روز تھا۔
آپ پوچھیں گے۔ بھئی عجب احمق ہو تم۔ آزادی کے پہلے روز یعنی پندرہ اگست کو تم کہاں تھے۔ جب سارے ہندستان میں اور خاص کر بمبئی میں اتنا شاندار اور عظیم اور بے مثال جشن منایا گیا۔ اُس وقت تم کہاں تھے۔

دراصل میں اس روز بھی بمبئی میں تھا۔ لیکن اتفاق دیکھئے، کہ اُس روز جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ورنہ خیال یہی کرتا تھا، کہ بیوی بچوں کو لے کر باہر چلوں گا۔ اور جشن آزادی کی دھوم میں مناؤں گا۔ مگر اُس روز گھر میں محض اتفاق سے صرف پانچ آنے تھے۔ اتفاق تو خیر اسے نہ کہئے دراصل اپنے ہاں ہر ماہ کی دس تاریخ تک تنخواہ بالکل صاف ہو جاتی ہے اب آپ ہی بتائیے۔ ایک سو روپوں میں بمبئی میں مہینہ بھر کیسے گزر ہو سکتی ہے۔ چالیس روپے تو مکان کا کرایہ ہے۔ اور ساٹھ روپیہ مہینے کا راشن آتا ہے۔ سو تو یہ ہوئے۔ اب دھوبی ہے۔ نائی ہے۔ لکڑی، کوئلہ۔ گھی، نون تیل، مصالحہ ہے۔ لوکل گاڑی کا پاس ہے۔ کبھی کبھار سینما ہے۔ صبح شام دو بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ آپ کہیں گے۔ یہاں یہ کھڑاگ لے بیٹھے، یہ تو ہر گھر کا قصہ ہے۔ تم اپنی دلچسپ کہانی سناؤ، جس سے جی بہلے۔ اور دل پر نشہ طاری ہو۔ اور آنکھوں میں سرور آئے اور

ہم بھی سمجھیں چلو شعرے کا ایک پیگ نہ پیا۔ اور بے وفا بیوی کا اسسٹنٹ پکچر نہ دیکھا۔ کرشن چندر کا افسانہ پڑھ لیا۔ سن لیا۔ دیکھ لیا۔ چلو آگے چلو۔

خیر جی۔ تو آگے چلئے۔ مگر دلچسپ بات یہ ضرور تھی، کہ آزادی کے روز گھر میں رقم نہ تھی، کہ جشن بہاراں منایا جا سکتا۔ دل میں یہ بھی امنگ تھی، کہ ترنگا جھنڈا مکان کے اوپر لہرایا جائے۔ مگر کمبخت بنیوں نے پندرہ اگست سے پندرہ روز پہلے ہی قومی جھنڈوں کے دام وہ بڑھا دیئے تھے کہ ہر کس و ناکس کے لئے جھنڈا مول لینا ناممکن تھا۔ اچھا جھنڈا دس سے سو روپے تک دستیاب ہوتا تھا۔ معمولی جھنڈے تو خیر تین چار پانچ روپے میں مل جاتے تھے۔ شوقین مزاج لوگوں نے ریشم کے جھنڈے سلوائے تھے۔ اور شارک سکن کی گاندھی ٹوپیاں۔ اور عورتوں نے ترنگی ساڑھیاں باندھی تھیں۔ اور جو بہت امیر لوگ تھے۔ انھوں نے گھروں کے باہر بڑے بڑے بجلی کے قمقموں سے ترنگے جھنڈے بنوائے تھے۔ جن کے بیچ میں سبھاش چندر بوس کی تصویر تھی۔ بڑی اچھی تصویر تھی۔ اپنا جی بھی ایسی ہی تصویر اور ایسی ہی ترنگی روشنی کے لئے ترستا تھا۔ لیکن جیب میں صرف پانچ آنے تھے۔ چنانچہ ہم نے تین آنے میں وہ ترنگا جھنڈا خریدا جو پتنگ کے کاغذ کا بنا ہوا تھا۔ دو آنے کے دال سیو چیوڑا لئے۔ اور پھاٹک کے اوپر سے پانی پی لیا۔ اور آزادی کی برکت کے گن گاتے ہوئے سو گئے۔ سنا ہے اُس رات کو سارا شہر بمبئی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہم لوگ تو جا نہیں سکے، کیونکہ لوکل گاڑی کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ اور اتفاق سے کسی

مانگا تو اُس نے دیا بھی نہیں۔

مگر دوسرے روز یعنی آزادی کے دوسرے روز ہم جی گئے۔ بمبئی آزاد بمبئی کی سیر کرنے۔ صبح ہی صبح پڑوس میں جو دھوبی رہتا ہے۔ اس سے دو روپے مانگ کے چلے عید کے پیچھے پڑھنے۔ جی بڑا خوش تھا، ہر چیز سے گویا مسرت پھوٹی پڑتی تھی۔ اپنے مکان کے باہر کتا دم ہلاتا ہوا جا رہا تھا سامنے کھپریل کی جھونپڑی سے بڈھے کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ بڈھا عرصے سے بیمار تھا۔ اور آج کل میں مرنے والا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ بیٹا مر چکا تھا۔ اور بہو نیمار داری میں مصروف رہتی تھی۔ مگر بے چاری کے پاس دوا دارو کے لئے پیسے کہاں ہوتے۔ اس لئے سادھو سنتوں سے راکھ کی چٹکی لاتی اور پانی میں گھول کے بڈھے کو پلا دیتی۔ اب پرمیشر کو منظور ہوگا تو بڈھا بچ جائے گا۔ مگر پرمیشر کو یہ کہاں منظور تھا۔ بڈھا آزادی کے دسویں روز چل بسا۔ مگر جیا تو سہی۔ دس روز آزادی کے تو اُس نے دیکھے۔ اگر آزادی سے پہلے مر جاتا تو غلام موت مرتا۔ اب آزاد ملک کی آزاد موت مر رہا تھا۔ مبارک ہیں اُس کے آخری لمحے۔ مجھے تو گھر سے نکلتے وقت بڈھے کراہنے کی آواز میں بھی خوشی کی جھلک نظر آئی۔ سامنے میدان میں اُپلے سوکھ رہے تھے۔ وہ خوبصورت کیک سے نظر آ رہے تھے۔ جیسے مرین ڈرائیو پر رستوران میں کیک نہیں ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ جب ہمارے دفتر کے منیجر ولایت جا رہے تھے انھوں نے مرین ڈرائیو کے رستوران میں ہماری دعوت کی تھی۔ سارے اسٹاف کی۔ اُس دن ہم بھی گئے تھے۔ کتنے عمدہ کیک

ملے تھے کھانے کو۔ لال لال اور نارنجی اور ہرے ہرے بسکٹ اور اوپر تازہ مکھن لگا ہوا۔ میں تو دو چار جیب میں ڈال کر گھر لے آیا تھا۔ بیوی بچوں نے بڑے شوق سے کھائے تھے۔ مگر یہ آزادی سے بہت پہلے کی بات ہے بات اُپلوں کی ہو رہی تھی نا۔ اُپلے چننے والی مرہٹن شانتا تھی۔ جس کی عمر ساٹھ برس سے اوپر تھی۔ اس کا کوئی نہ تھا۔ وہ اُپلے سکھا کر بیچتی تھی۔ مہینہ جائے دھوپ آئے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی ساڑھی پہنے جس میں درجنوں پیوند لگے تھے اُپلے سکھاتی، انھیں اکٹھا کرتی اور ٹوکری میں ڈال کر بیچنے میں مشغول نظر آتی اُس کی نظر کمزور پڑ گئی تھی۔ اور بازوؤں میں رعشہ تھا۔ اور سر بھی ہلتا تھا تو بھی وہ دن رات کام کرتی تھی۔

میں نے شانتا سے کہا: "ماں کل سے تو آزاد ہو گئی"

"ہاں بیٹا سنتے ہیں"۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر جلدی سے اُپلے چننے میں مشغول ہو گئی۔

میں نے کہا: "ماں بمبئی نہیں چلے گی۔ چل تجھے آزاد بمبئی کی سیر کرا لاؤں"۔

شانتا کہنے لگی: "بیٹا کیسے جاؤں۔ ابھی گاہکوں کے گھر یہ اُپلے پہنچانے ہیں۔ اور نہ گئی تو اپنے گھر میں چولھا کیسے جلے گا"

جب میں بازار کے نکڑ پر پہنچا۔ تو ترنگی جھنڈیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور پولیس والے چوک میں کھڑے اس گاڑی بان کو ہتھکڑی لگا رہے تھے جس کی گاڑی سے سیٹھ رنچھوڑ لال سکریا کی موٹر کا

ڈگارڈ چھو گیا تھا۔ نئی موٹر گاڑی تھی۔ سیٹھ نے آزادی کی خوشی میں آزادی کے ایک روز پہلے خرید کی تھی۔ چالیس ہزار روپے میں۔ اور اب اس کے ڈگارڈ سے وہ ذلیل چھکڑا ٹکرا گیا تھا۔ گاڑی بان نے بہتیرا کہا، کہ غلطی سیٹھ سکیریا کے ڈرائیور کی ہے۔ مگر لوگ اسی کو گناہگار ٹھہرا رہے تھے۔ اور در اصل اپنا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ یہ گاڑی بان بڑے بدمعاش ہوتے ہیں، جان بوجھ کر اپنی گاڑی کسی سیٹھ کی نئی موٹر سے بھڑا دیں گے۔ آزادی سے پہلے اس قسم کی باتیں برداشت کی جاتی ہوں۔ مگر اپنے آزاد وطن کے آزاد راج میں ایسی بے انصافی ممکن نہیں۔ یہی سوچتا ہوا میں خوشی خوشی آگے بڑھا تو اسٹیشن پر پونے گیارہ کی لوکل کو پانچ منٹ لیٹ پایا۔ بڑا حیران ہوا۔ کہ پونے گیارہ کی فاسٹ لوکل جو کبھی ایک آدھ منٹ بھی لیٹ نہ ہوتی تھی، آج پورے پانچ منٹ کیسے لیٹ ہو گئی۔ جب فاسٹ لوکل اسٹیشن پر پہنچی تو اسٹیشن ماسٹر نے بطور سزا فاسٹ ٹرین کو عام لوکل کر دیا۔ آخر اُسے کچھ نہ کچھ سزا تو ملنی چاہیئے تھی نا۔

گاڑی سے اتر کر۔ پہلے تو میں نے جی بھر کر بمبئی کی سیر کی۔ وہی خوبصورت عمارتیں تھیں، وہی بھرے ہوئے بازار، وہی بھکاری مخلوق۔ وہی شیر بازار کے سیٹھوں کی گاڑیاں۔ وہی کارخانوں کی چمنیاں۔ وہی مزدوروں کی گندی چالیں۔ وہی قمار خانے تھے۔ وہی ریس کورس، وہی اسٹاک ایکسچینج۔ وہی گداگر۔ وہی ہاکر، وہی فٹ پاتھ پر سونے والے۔ مگر جیسے آج ہر چیز آزاد تھی، خوش تھی۔ مسرت سے چمکتی چمکتی نظر آرہی تھی۔ جیسے عورت نہا کے اور کنگھی پٹی

کرنے کے بعد جھلکتی چمکتی سی نہیں نظر آتی ہے۔ بس ایسے ہی ہر چیز خوبصورت،
پیاری اور البیلی معلوم ہو رہی تھی، میرا دل مسرت سے بلیوں اچھل رہا تھا،
میں نے چار آنے کا پانی پوری کھایا۔ چار آنے کے گلاب جامن کھائے۔ ناریل
کا پانی پیا۔ اس کا گودا کھایا۔ پھر نمکین سینگ ٹھونگتا ٹھونگتا چرچ گیٹ
کی طرف آ نکلا۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ اور سنٹرل ٹیلی گراف آفس کے سامنے
پارسیوں کے کھلے مندر میں شمعیں خوب روشن نظر آتی تھیں۔ پارسی لوگ آ کے
ہات جوڑ کر ماتھا ٹیکتے۔ ہات جوڑتے منتر پڑھتے۔ کنوئیں سے پانی نکالتے،
اور پھر ہات جوڑ کر چلے جاتے۔ ایک بڑی خوبصورت پارسی لڑکی دیر تک ایک
امریکی سپاہی سے بات کرتی رہی۔ پھر وہ دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کے
چلے گئے۔ میں شری گوپال کرشن گوکھلے کے بت کے چبوترے پر چڑھ کے
سامنے میدان میں لڑکیوں کا ہاکی میچ دیکھتا رہا۔ بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں
ان کے بال کٹے ہوئے تھے۔ اور ان کی ٹانگیں کیسی صاف شفاف تھیں۔
جیسے انگریزی سینما میں ولایتی میموں کی ٹانگیں نظر آتی ہیں۔ میں دیر تک دیکھتا
رہا۔ پھر میچ ختم ہو گیا۔ اور میری توجہ یکایک چبوترے کے بت پر پڑی۔ گوپال
کرشن گوکھلے۔ اور میری نگاہوں میں تاریخ ہند کے وہ سنہری صفحات گھوم
گئے۔ جس میں شری گوپال کرشن گوکھلے کی قومی خدمات کا ذکر ہے۔ اور
میں وہیں چبوترے کے نیچے بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے ملک کے مستقبل کے
بارے میں سوچنے لگا۔ مجھ میں خیالی پلاؤ پکانے اور ہوائی قلعے بنانے کی
بہت بڑی عادت ہے۔ یونہی وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے گوپال کرشن گوکھلے

کے آزاد ہندستان کا خواب دیکھا۔ جہاں سب برابر ہیں۔ جہاں اب جنتا کا راج ہے۔ جہاں کل کے جیل کے قیدی آج کے راجہ ہیں۔ جہاں امیر و غریب کی تفریق مٹ گئی ہے۔ جہاں مزدور کارخانے چلاتے ہیں ۔ اور کسان زمین میں ہل چلا کر اپنی محنت کا پورا خراج وصول کرتے ہیں۔ جہاں سڑکوں پر کوئی نہیں سوتا۔ جہاں بجلی پانی مفت ہے۔ اور مکانوں کا کرایہ بہت کم ہے۔ اور کپڑے کے دام بھی زیادہ نہیں ہیں۔ جہاں بڈھی سشانتا کو اُپلے ڈھونے نہیں پڑتے کیونکہ اب اس کی عمر ساٹھ برس کے اوپر ہے، اور جہاں بیوہ بہو کے مرتے ہوئے سسر کے لئے دوا دارو کا بندوبست بھی ہے۔ بس میں دیر تک اسی طرح خوش خوش اپنے ملک کی آزادی کی ایسی ہی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ اور پھر مجھے اتنا بھی خیال نہ رہا، کہ شام ختم ہو گئی ہے۔ اور رات شروع ہو گئی ہے۔ اور سامنے کی سڑک سنسان ہو گئی ہے۔ اور گوکھلے مہاراج کا بت کالا پڑ گیا ہے۔ اور سامنے Eros سینما کی بتیاں خوبصورت گاؤنوں۔ ساڑھیوں اور پتلونوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔

میں اپنا سندر سپنا دیکھ رہا تھا، کہ کسی نے مجھے ٹھوکر لگا کر جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اُس آدمی کی طرف تکنے لگا۔ جو میرے سامنے کھڑا تھا وہ بولا۔ "کیوں۔ کوئی چھوکری ہے"؟

میں حیرت سے اس کی طرف تکنے لگا۔ اُس نے میری حیرت کا اندازہ کر لیا۔ اور اپنی غلطی کا بھی۔ کھسیانی ہنسی ہنس کے بولا۔ تم وہ نہیں

ہے۔ تو اس بنچ پر کیوں بیٹھا۔ یہ بنچ لڑکیوں کے دلالوں کا ہے۔ ہیں کیا سمجھے تمھارے پاس لڑکی نہیں ہے تو اس بنچ پر کاہے کو بیٹھتا ہے۔ سالا خالی پیلی حیران کرتا ہے۔

وہ بکتا جھکتا چلا گیا۔ میں نے مڑکر گوپال کرشن گوکھلے کے بت کی طرف دیکھا۔ جو اب اک تاریک سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے سوچا مجھے معلوم نہ تھا۔ آزادی کے چراغ تلے اتنا بڑا گہرا اندھیرا ہوگا گوپال کرشن گوکھلے کا جھکا ہوا تاریک بت سوالیہ نشان بنا چپ چاپ کھڑا تھا ٭٭٭

چھٹی حِس

لڑکیاں روپے کو اس طرح کھاتی ہیں جیسے دیمک لکڑی کو۔ میں کارنیلیا ہوٹل میں بیٹھا ہوا چائے کی پیالی سامنے رکھے اُس روز سوچ رہا تھا۔ جیب میں چار آنے تھے پانچ مہینے میں بیس ہزار روپے کمائے تھے اور اب صرف چار آنے جیب میں تھے، ہوٹل کے باہر موسم بے حد خوشگوار تھا۔ رم جھم بارش، اور اینگلو انڈین اور پارسی لڑکیوں کی بھیگی ہوئی ٹانگیں شفاف برساتیوں میں دمکتی ہوئی گزرتی تھیں۔ میں نے دیکھا کچھ ٹانگیں کنواری ہیں۔ کچھ شادی شدہ، اور پھر کچھ نئی شادی شدہ تھیں۔ کچھ پرانی، کچھ طلاق لے چکی تھیں۔ کچھ نئے خاوندوں کی فکر میں تھیں۔ کچھ ٹانگیں حاملہ تھیں اور کچھ

روزِ ازل سے بانچھ پن کا بیمہ کرا کے آئی تھیں۔ افسردہ ٹانگیں۔ یاس و نکبت کی ماری ہوئی ٹانگیں۔ مسرت افروز ٹانگیں، بہجت خیز ٹانگیں۔ سڈول و بیباک ٹانگیں، بید کی شاخ کی طرح گدرائی... ہوئی۔ بھاری بوجھل بے ہنگم ٹانگیں جن پر کسی ظالم خاوند نے سات بچوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔ انسانی زندگی میں چہروں کی تفسیر سے ٹانگوں کی تفسیر کہیں بہتر ہے۔ لوگ چہرے پڑھتے ہیں تو میں ٹانگیں پڑھتا ہوں۔ شاید اسی لئے میری جیب میں آج صرف چار آنے تھے۔

دو سانولی سلونی ٹانگیں، چوبیس انچ مُہری والی پتلونوں کے ساتھ آئیں۔ اور ہوٹل کے برآمدے میں سے گزر کر سامنے کی میز کے قریب کرسی پر جلوہ افروز نظر آئیں۔ پتلون بار بار سلونی ٹانگوں سے ٹکرا جاتی۔ میں نے نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ ایک جامن اور ایک امرود ساتھ ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ جس کا رنگ سانولا تھا۔ اور جس کے ہونٹوں پر کاسنی رنگ کی لپ اسٹک تھی اور جس کے بال سیاہ تھے۔ وہ جامن تھی۔ اور وہ جس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ جس کے بال کھچڑی تھے۔ اور جس کی ٹھوڑی بیچ میں کشیدہ تھی۔ وہ امرود تھا۔

امرود نے کہا: "مجھے تمہارا نیا لپ اسٹک پسند ہے"

جامن نے مسکرا کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا، میز کے نیچے ٹانگیں ہلیں۔

امرود نے کہا: "کل مجھے تنخواہ ملے گی تو پھر بیبین چلیں گے۔ پک نک پر"

جامن نے نگاہیں نیچی کر کے چائے کی پیالی میں دیکھنا شروع کر دیا۔ بیبین کی پک نک کتنی دل فریب ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بیک ہوٹلوں میں برامدوں

میں بیت کے مونڈھے اور سامنے تازہ تاڑی یا گنگنی شراب۔ مُصفّا ہوا میں نشے کا عطر نگاہوں میں جنسی جذبے کی پینگیں، میلوں تک پھیلے ہوئے جنگلوں میں چہل قدمی، بسین کے پرانے قلعے کا پُر شکوہ منظر، کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوئے فاکس ٹراٹ، اور شام کو واپس آتے ہوئے اسٹیشن پر گوانی اور کرسچین نوخیز کلیوں کی آہستہ خرامی، اسٹیشن کی مدھم بتیوں کی دھیمی دھیمی روشنی ٹمٹماتے ہوئے گالوں پر پڑ رہی ہے۔ فضا میں اکارڈین کا نغمہ گونج اٹھتا ہے۔ کولھوں کا جھولنا، نشیلے پاؤں کی سہانی لغزشیں، اسٹیشن کے سخت فرش پر ٹیپ ڈانس کی دھمک۔ لو وہ گاڑی آگئی ... ...

چائے کی پیالی ختم ہوگئی۔ جامن نے کہا "ہاں ضرور۔ پر اب تو (گھڑی دیکھ کر) مجھے منیجر صاحب کا ڈرافٹ ختم کرنا ہے۔ اچھا، میں چلتی ہوں"

جامن چلی گئی۔ امرو بھی ساتھ ہی اٹھ گیا۔ یکایک میری نگاہ ایک نہایت ہی بھولے بھالے معصوم چہرے پر پڑی۔ کوئی بائیس برس کا نوجوان ہوگا۔ رنگت جیسے چھونے سے میلی ہو۔ آنکھوں میں ایک ستھری ستھری سی چمک جیسے ساحل پر پانی سے دھوئے ہوئے سنگریزے چمک اُٹھتے ہیں۔ چال میں طمانیت۔ لباس میں اک فاخرانہ سادگی۔ جیسے اُس کی شخصیت کہہ رہی ہو، ہم چاہیں تو اس سے ہزار درجہ بہتر لباس زیب تن کرلیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ یہ شرافت کے خلاف ہے۔ یہ نوجوان میری نظروں میں بچ گیا۔ میں اس کا دعوے تو نہیں کرتا۔ کہ ماہر نفسیات ہوں ہاں ماہر حیات ضرور ہوں۔ شاید کہیں میرے کرہو میں انسان کی چھٹی حِس ضرور چھپی ہوئی ہے۔ جو میرے ادراک کو زندگی کے نہاں خانوں۔ تہ نشینوں اور تاریک ترین کونے

کھدروں سے بھی آشنا کرتی رہتی ہے۔ جیسے اندھیرے میں کوئی دیا سلائی کو آگ دکھا دے۔ اسی طرح ہر چیز اس چھٹی حس سے خود بخود روشن ہو جاتی ہے۔ اور یہاں تو اندھیرا تھا ہی نہیں۔ روشنی تھی نہ جانے کیوں۔ میں پہلی نظر ہی سے آدمی کو بھانپ لیتا ہوں۔ اکثر اوقات خوبصورت اشیا مجھ پر غیر جمالی تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اور بدصورت ترین اوصاف اس حس سے رگڑ کھا کر چمک اٹھتے ہیں۔ ہیرے جواہرات کی طرح، اور یہ میری چھٹی حس کبھی دھوکا نہیں دیتی۔ ہر آدمی اپنی شخصیت سے ایک خاص قسم کی ذراتی قوت مترشح کرتا رہتا ہے۔ یہ قوت یا تو اس قدر دلکش ہوتی ہے کہ ہر فرد ہزار برائیاں دیکھتا ہوا بھی خود بخود اس کی طرف کھنچتا ہوا چلا آتا ہے۔ یا اس قدر تنافر انگیز ہوتی ہے کہ فرد اس کی حسین ترین تجسیم کے باوجود اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور یہ سب کچھ پہلے لمحے میں ہوتا ہے جب ایک شخصیت دوسری شخصیت سے ٹکراتی ہے۔ یہ ذراتی لہریں بھی عجیب و غریب ہیں اور شاید اسی سبب سے آئین اسٹائین نے کہا تھا کہ ہم لوگ ایتھر کی لہروں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔

بہرحال اس وقت میرے سامنے یہ خوبصورت نوجوان تھا۔ اس شہر میں نووارد معلوم ہوتا تھا۔ جو لوگ بمبئی کے نہیں ہوتے وہ لوگ بمبئی میں بالکل صاف پہچانے جا سکتے ہیں۔ اور سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بمبئی میں کسی فرد کا چہرہ اس قدر بھولا بھالا اور معصوم نہیں ہوتا۔ یہاں زندگی کی معصومیت دس سال کی عمر میں فنا ہو جاتی ہے یہاں کے اسکول کے بچوں ہی کو لیجیئے۔ اس قدر بڈھے چالاک اور پرفن دکھائی دیتے ہیں۔ ریس یہ کھیلتے ہیں۔ سٹہ یہ لگاتے ہیں۔ بلیک مارکیٹ کا سودا یہ کرتے ہیں۔ سینما یہ دیکھتے ہیں، بے بی نور بانو سے بڈھی بیلا دیوی تک ہر فلم ایکٹرس کے شجرہ نسب سے یہ واقف ہیں

یہ بچے نہیں ہیں۔ یہ بڈھے بالک ایک خبیث تہذیب، ایک شیطانی سماج، ایک مدقوق و مجذوم نظامِ زندگی کے شکار ہیں۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو، کہ سرمایہ دارانہ سماج انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے تو اُسے بمبئی کے بچے دیکھنے چاہئیں۔

مگر یہ نوجوان تو بمبئی کا نہ تھا۔ بچہ بھی نہ تھا۔ اور بچہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے چہرے پر، اور اپنی ساری شخصیت پر بچوں کا سا بھولپن لئے ہوئے تھا۔ وہ آتے ہی اسی میز پر بیٹھا جہاں اس کی آمد سے چند لمحے پہلے جامن اور امرود بیٹھے تھے۔ پھر اُس نے مسکرا کر اپنے لئے چائے کی پیالی اور کریم رول طلب کئے۔ چائے پیتے ہوئے وہ خود ہی مسکرا رہا تھا۔ کسی کی طرف دیکھ کر نہیں۔ اپنے ہی اندر۔ اپنے آپ ہی مسکرا رہا تھا۔ جیسے مسکرانا۔ خوبصورت دکھائی دینا۔ معصومیت سے رہنا اس کی زندگی کا فطری لاشعوری، آزاد جذبہ تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے ایک کریم رول اٹھایا۔ کس قدر بھولا بھالا سا ہاتھ تھا۔ فرشتوں کی سی پاکیزگی لئے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ کریم رول نہیں کھا رہا ہے۔ پھولوں سے مشامِ جان کو تازہ کر رہا ہے۔ اس کی شخصیت کی ہر ادا میں ایک عجیب سی رعنائی تھی۔ میں مبہوت ہو گیا۔

چائے کے دو گھونٹ پی لینے کے بعد اس نے اطمینان سے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ اور پھر اپنی جیب میں سے اک لفافہ نکالا۔ اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر اُسے پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے وہ پھر مسکرایا۔ اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سا غیر مرئی نور بکھر گیا۔ اُس کی نگاہیں لپک اُٹھیں۔ گال سرخ ہو گئے۔ ہونٹ ہلکے سے تبسم سے کانپنے لگے۔ جیسے پھول کی نازک پنی شبنم کے بار سے کانپنے لگتی ہے میں نے سوچا بمبئی میں یہ معصومیت کہاں سے آگئی۔ یہ صبیح حسن۔ یہ متانت یہ اپنے

آپ گنگناتا ہوا بھولا پن۔ اُس خط میں کیا تھا جسے وہ پڑھ کر یوں خوش ہو رہا تھا۔ جیسے ساری کائنات میں پھول ہی پھول ہنس پڑیں۔ اپنے محبوب کا خط ہوگا " جان سے پیارے میں یہاں اس چھوٹے سے گاؤں میں اس چھوٹی سی ندی کے کنارے اس چھوٹے سے انجیر کے پیڑ تلے تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔ بمبئی میں زیادہ دن نہ ٹھہرنا۔ سنا ہے وہاں فلمی پریاں ہوتی ہیں جو چپٹ سے آدمی کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہیں۔ اور پھر وہ آدمی واپس گھر نہیں آسکتا۔ میری جان میں یہ تصویر تمھیں بھیج رہی ہوں۔ اسے گلے میں لٹکا لو۔ پھر کوئی فلمی پری تمھارا کلیجہ نہ نکال سکے گی۔ جلد سے جلد میرے پاس واپس آجاؤ۔ میں نے گلاب کے پھول کے کان میں تمھارا ذکر کیا ہے۔ اور اب اسے شاخ سے توڑ کے اپنے جوڑے میں لگا رہی ہوں۔ اسی طرح مجھے بھی اب تم اپنے قدموں سے لگا لو۔ تمھاری سنہیلا "۔ ہر محبوب کا خط ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا۔ کسی میں فلسفہ زیادہ ہوتا ہے۔ کسی میں کم۔ بات ایک ہے۔ کوئی نمک زیادہ کھاتا ہے۔ کوئی کم۔ لیکن کھانا سبھی پسند کرتے ہیں۔ محبت کے بغیر دنیا میں جینا مشکل ہے۔ عورت اور مرد کی محبت کے بغیر۔ اب اس میں کوئی کتنا ہی نمک مرچ ملالے۔ یہ اپنی اپنی پسند ہے۔

نوجوان نے ایک دفعہ پھر اُس کاغذ کو پڑھا اور مسکرایا۔ پھر وہ اُسے تہ کرنے لگا۔ میں نے سوچا۔ یہ سنہیلا کا خط نہیں ہو سکتا۔ ورنہ وہ اس قدر معصوم تھا کہ وہ اسے ضرور اسی جگہ اسی ہوٹل میں سب کے سامنے اپنی آنکھوں سے اپنے کلیجے سے لگاتا، اسے چوم لیتا۔ لیکن وہ اُسے یونہی چپ چاپ مسکراتے ہوئے تہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا نہیں۔ یہ سنہیلا کا خط نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی پہلی ملازمت کا پروانہ ہے۔ بائیس سالہ

جوان کی پہلی ملازمت"، ہمیں تمہاری دس جولائی کی عرضی ملی۔ کافی غور و خوص کے بعد ہم تمہیں اپنے فرم میں کارسپانڈنٹ کلارک کی آسامی پر تعینات کرتے ہیں۔ تنخواہ پچاس روپے۔ الاؤنس دس روپے۔ سال میں بارہ دن چھٹی۔ فرم میں پندرہ تاریخ کو حاضر ہو جاؤ۔ مینیجر فرم ہذا"

میری چھٹی حس نے کہا۔ ہو نہ ہو یہ محبوب کا خط نہیں۔ یہ ملازمت کا پروانہ ہے۔ نوجوان کس قدر خوش معلوم ہوتا تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ اس بے کاری کے زمانے میں اگر کسی ملازمت مل جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے راشن مل گیا۔ سال میں کپڑوں کے دو جوڑے مل گئے۔ رہنے کے لئے آٹھ فٹ لمبا آٹھ فٹ چوڑا کمرہ مل گیا۔ بجلی کا ایک قمقمہ اور پانی کا ایک نل مل گیا۔ زندگی کتنی سیدھی سپاٹ ہو جاتی ہے۔ کوئی ال بل نہیں رہتا۔ صبح سات بجے اٹھ کر ساڑھے نو تک ضروری حوائج سے فارغ ہو کر دفتر پہنچ جاؤ۔ چھ بجے فارغ ہو کے سینما میں گھس جاؤ۔ رات کے دس بجے گھر پہنچ کر سو جاؤ اور صبح اٹھ کر پھر وہی نپی تلی زندگی ——— نوجوان یقیناً اپنی ملازمت پا کے ہی اس قدر خوش تھا۔ تمہاری خوشی تمہیں مبارک ہو اے نوجوان۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ لیکن مجھے افسوس اس امر کا رہے گا کہ ملازمت پاکر تم بہت جلد اس خوبصورت معصومیت کو کھو بیٹھو گے۔

نووارد نے کاغذ تہ کر کے اُسے پھر لفافے میں رکھا۔ اور اسے اپنی چائے کی پیالی کے پاس چھوڑ دیا۔ پیالی اس کے ہاتھ میں لبوں تک آئی اور پھر واپس میز پر چلی گئی۔ وہ اپنے خیالوں میں غرق تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا شاید سنہیلا اور ملازمت دونوں کے متعلق۔ یا ممکن ہے یہ اس کی والدہ کا خط ہو۔ بیٹا پہلی بار ملازمت حاصل

کر کے بمبئی جا رہا تھا۔ گھر کی، خاندان کی، برادری کی، اُس گاؤں کے لوگوں کی ساری امیدیں اس نوجوان کی ترقی سے وابستہ تھیں۔ وہ اپنی نوحہ کناں یاس کو ایک سبز وشگفتہ آرزو میں مبدل ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس نوجوان کی شخصیت میں بچپن بس جس سے وہ گرد یا کھیلی تھی۔ جوانی میں اُس نے جس سے شادی رچائی تھی۔ نو مہینے جس خواب کی تکمیل کرتے ہوئے اُس نے زندگی کا سہارا حاصل کیا تھا۔ اُس زندگی کی سپنے میں اُس کی ماں نے آج اپنی زندگی کی معراج دیکھی تھی "بیٹا" ماں لکھ رہی تھی۔ اور بیٹا یہ خط پڑھ کر مسرور ہو رہا تھا "بیٹا! بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ سنا ہے وہاں ٹرام چلتی ہے۔ ذرا ٹرام سے بچ کر رہنا۔ بیٹا شام کو سورج چھپنے سے پہلے چچا کے گھر لوٹ آنا۔ ہر روز شام کے بعد بمبئی میں نہ گھومنا۔ وہاں بڑا خطرہ ہے۔ بیٹا کام جی لگا کے کرنا تاکہ مالک تجھ سے خوش رہے۔ بہن تجھے بہت یاد کرتی ہے۔ منگل کے روز وہ تجھے اپنے ہات سے مٹھائی بنا کے پارسل کرے گی۔ پارسل کی رسید ضرور بھیجنا۔ تمھاری ماں"

ہاں یہ ماں کا ہی خط تھا۔ جسے پڑھ کر وہ یوں سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ ایک حسرت آمیز سوچ۔ ایک روشن مستقبل کی آرزو۔ ایک نئے جیون کی امنگ۔ اس کا چہرہ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ اسی سوچ میں اُس نے آہستہ آہستہ سے اپنی چائے ختم کی۔ اور بل دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں بھی وہاں سے اُٹھا۔ اس کی میز خالی تھی۔ ہاں جیسے ابھی تک وہاں اس کی حسین شخصیت کا نور سا چھن رہا تھا۔ ارے یہ کیا۔ میں نے دیکھا۔ وہ نووارد جلدی میں اپنا قیمتی خط وہاں بھول گیا تھا۔ ابھی بہت دور نہ گیا

ہوگا۔ میں نے جلدی سے اُس خط کو اٹھایا۔ تاکہ بھاگ کر اُسے دے دوں۔ ہوٹل کے دروازے تک تو میرے قدم بہت تیز تھے۔ مگر پھر یہ سوچ کر دھیمے ہو گئے کہ لاؤ اس خط کو پڑھ لیں۔ دوسرے کا خط پڑھنا بہت معیوب بات ہے۔ مگر جی نہ مانا۔ پھر پڑھ لو۔ اس میں ہے کیا۔ اور میں نے خط کھول ہی لیا۔ لفافے کے اندر سفید کاغذ کے ساتھ گوند سے چپکا ہوا ایک اخبار کا ٹکڑا تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا۔

ایک خوفناک قتل

کل رات روڑی گاؤں کے زمیندار بھورا کو کسی نے قتل کر دیا۔ لاش پر چھرے کے زخموں کے نشان تھے۔ مقتول کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ اپنے بھتیجے شنکر کے ساتھ اپنے گھر میں رہتا تھا۔ اس کا بھتیجا شنکر اسی رات سے مفرور ہے تجوری سے بیس ہزار کے نوٹ غائب ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ یہ قتل شنکر نے کیا ہے۔ شنکر کا حلیہ یہ ہے۔
قد میانہ۔ جسم اکہرا۔ رنگ گورا۔ چہرہ گول۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ ہونٹ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں ''

× × × × ×

میں دیر تک اس کاغذ کو اس اخبار کے پرزے کو دیکھتا رہا میری چھیٹی حس نے کہا۔
" تمھاری جیب میں صرف چار آنے ہیں۔ اور تم نے اب تک چائے

کی چار پیالیاں ختم کی ہیں۔ چار پیالیوں کے پیسے آٹھ آنے ہوتے ہیں۔ اور تمھاری جیب میں صرف چار آنے ہیں"۔

میں نے غصے سے کہا: "بس چپ رہیں۔ ذرا چپ بیٹھئے۔ میں اس وقت آپ سے بات کرنے کے حق میں نہیں ہوں!"

ناپخت

بلبلِ ہندستان
شریمتی گلنار جوجو پلی کنگ نا سیاست ستیاناس بکواس فلفل دراز اللہ شافی حکیم
اجمل خاں خاناں ابوالکلام آزاد ماہم نادر ورِدآؤٹ کرکٹ کلب آف انڈیا ریڈیو
ببیرہ بھیتر دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا کہ شام نے پکارا، ابے
حسین کدھر بھاگ گیا تھا۔

جی میں ... حسین بولا

بس کیا۔

ذرا باہر چلا گیا تھا۔ میرے ماموں جان آئے ہوئے ہیں۔ اور پھر مجھے
کل بھی آدھے دن کی چھٹی چاہئے، خورشید بائی ۔۔
خورشید بائی کے سالے
دیکھئے صاحب گالی نہ دیجئے۔ اور سب کچھ کہہ لیجئے۔ اُسے گالی نہ دیجئے
آپ مجھے ہر طرح کی گالی دے سکتے ہیں۔ لیکن خورسید بائی کو کچھ نہ کہئے
کھڑا رہ
حسین کھڑا ہو گیا۔
ڈنڈ پیل
وہ ڈنڈ پیلنے لگا۔
تیواری کے دماغ میں مکھیاں گھسنے لگیں۔ میں غریب ہوں۔ یہ اس
کا نوکر بھی غریب ہے۔ بھنگی سالا مجاق کرتا ہے۔ اس طاق میں آنتا ہے۔
گویا کی نزاکت کی دیوی خراماں خراماں من مندر میں گھس آئی تھی،
پجارن نے دروازہ کھول دیا تھا، اور پٹ توڑ دیئے تھے۔ کھورسید بائی کی ماں،
لیکن یہ تو سوچئے۔ کہ تڑاں جی ادبی او فل لا اڈرا دا تخیل داں ہندستانا ن
مسلمان تھی رآں خاں ائیل لاکر خاں فل تو کریکل جنبش مژگاں ۔!
شیام نے ایک سگریٹ حسین کے منہ میں دیا۔ پی۔ عیش کرے۔ اچھا
یہ بتا۔ تجھے اس خورشید بائی سے عشق کب ہوا۔
جی۔ میں تب بہت چھوٹا تھا۔ وہ ہمارے قصبے میں رہتی تھی، میرے
باپ نے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ ایک دن مجھے کھورسید بائی کی

ماں مل گئی۔ کہنے لگی۔ تو ہمارے ہاں نوکر ہو جا۔ میں نے منظور کر لیا۔ تو جی میں وہاں نوکر ہو گیا۔ کھورسید بائی دسویں میں نہیں نویں میں نہیں دسویں میں پڑھتی تھی۔ شام کو جب میں اس کا کمرہ صاف کرنے جاتا۔ تو وہ مجھ سے بہت سی ادھر ادھر کی باتیں کرتی۔

کیا باتیں ؟ ۔ شیام سگرٹ پیتے ہوئے دھوئیں کے حلقے بنانے لگا۔

جی کچھ نہیں۔

سالا

جی بتاتا ہوں۔ وہ مجھے ـــ رانوں میں چٹکیاں لیا کرتی تھی۔

اور تو

جی۔ میں۔ میں میں۔ میں چپ ہو رہتا جی۔ پر مجھے وہ بڑی اچھی لگتی تھی۔ پھر وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ سورت چلی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ سورت گیا۔ کیونکہ جی خدا نے جہاں بنایا ور کا ای جہاں ڈالے۔ بردی زبان گم گم۔ فوراں بھاق کھائے۔

شیام بولا۔ پھر کیا ہوا ؟

پھر یہ ہوا جی۔ حسین بولا۔ اس کی بڑی بہن جو سورت بیاہی ہوئی تھی مجھے ہر روز پیٹنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے سنگ رہوں۔ پر میں نہ مانتا تھا میں تو کھورسید بائی۔ ہی ہی ہی۔

دانت کیوں نکالتے ہو۔ شیام نے گرج کر فنگفنگھارا

حسین لچک کر مسکرایا ۔ جی بہت اچھا۔ اس کی آواز میں بلائیں خوشامد
ڈرپوک کی نرماہٹ آنگا ۔ پر وہ پھر بھی مسکراتا رہا ۔ بولا ۔ حضور تو میں نے تنگ
آکر وہ نوکری چھوڑ دی ۔

تو پھر تیرے کھانے پینے کے لئے کیا بندوبست ہوا ہوگا ۔

کھورسید بائی نے مجھ کو دس روپے دیئے ۔ میں ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا
پھر میں وہیں نوکر ہوگیا ۔ ہم کبھی یہاں ۔ کبھی وہاں ملتے تھے ۔ پھر کھورسید بائی
احمد آباد چلی گئی ۔ میں نے ہوٹل کی نوکری اٹر فینگچ کردی اور احمد آباد کو پیاڑ
ہوگیا ۔ میری جیب میں اس وقت جب میں احمد آباد پیاڑ ہوگیا صرف سح
آنے لا ہیئے ۔ اسفیخ آنوں سے گیڑا چوٹا ۔ میں اس طرح بھاگم بھاگ
نوکری کی تلاش میں الفتوریا رہا ۔ لیکن نوکری کہیں نہ ملی ۔ اور نہ ہی کھورسید
بائی ۔ یکایک ایک کوئلے کی دکان پر جاکر جو میں کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ
کرعین اوپر سہ منزل پر وہ محبوب طرزی اعلیٰ گارڈن فرگراج ہے ۔ اس نے
مجھے ہات سے اندر آنے کا فلارہ جیا ۔ میں جھٹاک سے اندر گھسا اور سیڑھیوں
کے اوپر چلتا گیا ۔ وہ اکیلی تھی ۔ اس کی بھابی باہر گئی ہوئی تھی ۔ میں اسے دیکھ
کر رونے لگا ۔ اس نے مجھے پندرہ روپے دیئے ۔ میں پندرہ دنوں میں سب
ٹراٹ کر دیئے ۔ کیونکہ زرخواری کی تمنا میرے دل میں ہے ، بلبل جو رنگ باری
اسیر جنگل میں ہے ۔ فلسفے !

شیام نے کہا ۔ فلسفے ! مگر یہ بتاؤ آگے کیا ہوا ۔

حسین نے کہا ۔ جی مجھے کل چھٹی چاہئے ۔

منظور

اور پانچ روپے چاہئے۔ میں نے ہوٹل والے کا بل ...

منظور ــــــ آگے چلو

فلا آج کا حساب دیکھ لیجئے

صبح دیکھیں گے۔ اب جا گے فلو

حسین جاگے فلکر بہنے لگا۔ تو صاحب میں وہاں پورے دو مہینے رہا۔
اور کھود سید بائی نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ میں زندگی بھر اس کے سلوک کو نہیں بھلا سکتا۔ ایسی خوبصورت پارسن میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ اندنوں میٹرک میں تھیں نویں میں نہیں دسویں میں پڑھتی تھی۔ پھر چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ واپس قصبے میں آ گئی۔ لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے گھر اس طرح نہیں جا سکتا۔ میرا باپ کہے گا کہ جگرا آوارہ پھرتا رہا ہے۔ رنج لگام نہیں کیا

فنے فنے۔ ستیام نے کہا

توصاحب اس نے مجھے پچیس روپے اور دیئے۔ اور میں نے گھر جا کر بڑے ٹھاٹ سے اپنے باپ کے حوالے کئے۔ ماں باپ بے حد دستیاب ہوئے کہ بیٹے نے رنج لگام کیا۔ اسی لئے تو وہ اتنی پگار گھر لایا ہے۔ واللہ مکرر ارشاد ہو۔ جزاکم اللہ تھو قاضی دواکشا سوز مبک آمی حن آمسلمان ہسندد فساد ہلڑ۔

یتواری بولا۔ بھنگی جھوٹ سلگتا ہے۔ ایک بات بھی سچ نہیں ہے۔ بڑا مکوڑا جگرا ہے۔ آں۔ امی۔ او۔ ٹولڈ یو تو سنڈگمی بٹ یوڈونٹ

جی۔ میں نے کھورسید سے ایک دن کہا۔ یہ بات مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ بولی عمر تو میرا محبوب بھائی ہے۔ بس سو فیبن نہ پوشے۔ ہمی بلا اور کون چھوٹے ؟

میں نے کہا۔ تب ٹھیک ہے۔

تو صاحب عمر کے خط اور کھورسید بائی کے خط میں پہنچا تا رہا۔ پھر عمر بمبئی میں پڑھنے کے لئے چلا آیا۔ اور اب کھورسید بائی بھی وہیں ہے۔ عمر مجھے ریس میں ملا تھا۔

تم اب کیا چاہتے ہو

جی، میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں تو نوکر پیشہ ہوں۔ اگر میں عمر کی طرح کالج میں پڑھتا۔ تو فنگ فنکار کر دیتا۔ لیکن افسوس تو یہی ہے کہ با بیخا نوبت برسید کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی بر فناک۔ آفتاب میں لگادی کرن پاپوش ملنے کی۔

جاگے فلو۔ شیام بولا

حسین بولا۔ کل رات کو وہ مجھے خواب میں ملی تھی۔ میری روح کا ذرہ ذرہ اس پر قربان ہے۔ میں نوکر آپ کا ہوں۔ لیکن غلام اس کا ہوں اگر میں غریب نہ ہوتا ...

حسین رونے لگا

تم کھورسید بائی کی نوکری کروگے۔

جی ہاں۔ میں اب بھی اگر وہ بلائے تو فوراً چلا آؤں گا۔

بھنگی سالا۔ نیواری بولا۔

جی مجھے گالی نہ دیجئے اور جو مرضی کہہ لیجئے۔ لیکن مجھے گالی نہ دیجئے
ڈنڑ پیلو۔ شیام نے کہا
حسین ڈنڑ پیلنے لگا۔
شیام سوچنے لگا۔ یہ امتیاز امیر و غریب میں، یہ محبت میں دولت کی دیواریں۔ اگر حسن آج بیگ نہ ہوتا تو آج وہ کھورسید بائی کی ماں سے بھی شادی کی اجازت لے لیتا۔ کیا ادب میں زندگی روا ہے۔ کیا زندگی میں۔ اس زندگی میں محبت روا ہے۔ کہ وہ خوب کھائے۔ سبائے۔ اور پی کر نفتوش ہو جائے۔
اس نے حسین کو جیب سے سچ روپے نکال کر حوالے لئے۔ اور خود کروٹ بدل کر سو گیا۔

x x x

دوسرے دن اس کا بٹوا خالی تھا۔ اور حسین فرار ہو گیا تھا۔ ہم میں کھورسید بائی کو ڈھونڈ رہا تھا، شیام اسدن بھوکا رہا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس طرح بھوکا رہنا پڑا۔ اب جا کر اُسے احساس ہوا کہ ... ...
اگر سب انسان سرمان ہوتے تو یہ دنیا تضاد تدر کے نمونے جیسے سٹ اینڈ کمپنی بلاک میکر سالنامہ کا عدمیں ہے ہوتی۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ انسان کے دل میں وہ شعور ہی پیدا نہیں ہوا اور وہ اسی طرح اندھا نباہی کی غار میں چلا جا رہا ہے۔ زنہار کہ ترجامنڈ انگ رہی تا لے۔ جائیں تو کہاں جائیں ہم بھوک نگر والے۔!

جوتے پہنوں گا

فضل نے کبھی جوتے نہیں پہنے تھے۔ ان اٹھارہ برسوں میں وہ ننگے
پاؤں ہی چلتا رہا۔ جوتے پہننے کو اس کا جی تو بہت چاہتا تھا۔ مگر اسے آج تک
کبھی ایسا موقعہ ہی نہ ملا۔ کہ وہ جوتے پہن سکتا۔ بچپن یتیم خانے میں گزرا۔ جہاں
ملا جی قمچیاں ار مار کے کھال اُدھیڑ دیا کرتے تھے۔ وہ سرخ آنکھوں والا اور
گنجی داڑھی والا مینیجر تھا۔ جو انہیں صبح و شام بھوکا رکھتا تھا۔ یعنی کھانا تو صبح کو بھی
ملتا تھا اور شام کو بھی۔ لیکن دونوں وقت اس قدر کم ملتا تھا۔ کہ نیت ہر وقت
کھانے میں لگی رہتی تھی۔ کھانے کی چیز کو دیکھ کے چاہے وہ کہیں بھی پڑی ہو

دل پر پاگل پن سا سوار ہو جاتا تھا۔ اور ہاتھ اسے چھین کر منہ میں ڈال کر ہڑپ کر جانے کے لئے بے اختیار آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس مسلسل بھوک نے فضل کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ٹٹولا کرے۔ جھوٹے آم، سڑے گلے سڑے سنگترے کیلے بھی مل جاتے تھے۔ کتنے لذیذ ہوتے تھے وہ پھل، اور کبھی کبھی میراں شاہ حاجی کے پچھواڑے میں آم کی گٹھلیوں کے ساتھ ساتھ نمکین بریانی کا سوندھا ذائقہ اور مرغ کی چچڑی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ کہیں کہیں لگا ہوا نرم نرم گوشت، ایسے وقت میں فضل کی آنکھیں گویا اشتہا کی لذت سے پھٹنے لگتیں۔ اس کی زبان کھنچ کر ہتھیلیوں میں چلی آتی۔ رات کو خواب میں اس نے اکثر بریانی کے پہاڑ دیکھے تھے۔ اور آموں کے ڈھیر، اور مرغ مسلم کی قطاریں اور وہ ہمیشہ شور مچاتا ہوا جاگ جاتا تھا۔ اور ملاجی سے با نیجر سے بری طرح پٹتا۔

اس کے دماغ پر ہر وقت مطبخ کی خوشبوؤں کا کہر سا چھایا رہتا۔ اور ایک اذیت ناک ناآسودگی کا کچی ڈھول کے ستے ہوئے چمڑے کی طرح اس کے سارے اعصاب پر منڈھا ہوا تھا۔ اُسے کہیں سے بھی ذرا ہاتھ لگانے سے بھوک کا نغمہ بج اٹھتا تھا۔ وہ کھانے کے متعلق سوچتا تھا۔ کھانے دیکھتا تھا کھانے سونگھتا تھا۔ کھانے سنتا تھا۔ ملاجی نے ہزار بار کوشش کی کہ وہ دو رکعت نماز کے ٹھیک طرح سے ادا کر سکتے لیکن بھوک کے مسلسل غیر مختتم تشنج نے دماغ کے ہر خلئے کو اس قدر ماؤف کر دیا تھا کہ اب کوئی اور چیز وہاں گھسنی نہ تھی۔ گھس ہی نہ سکتی تھی۔ اور گھستی بھی تو فوراً باہر نکال دی جاتی۔ بھوک کا غلبہ اس قدر شدید تھا۔

اسی بھوک کے غلبے کی وجہ سے وہ یتیم خانے سے بھی نکالا گیا۔ کند ذہن اور غبی تو وہ تھا ہی۔ اب اس نے چوری کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ روپے پیسے کی چوری نہیں۔ کھانے کی چوری، دو چار بار وہ ملاجی اور مینجر کے مرغن کھانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ ٹھکائی تو وہ ہوئی کہ اس کے بعد وہ دس بارہ روز تک چٹائی پر سے نہیں اٹھ سکا۔ لیکن اس کھانے میں بھی کیا مزا تھا۔ جیسے روح کے روئیں روئیں میں بالیدگی رچ گئی ہو۔ جیسے صدیوں سے تپتی ہوئی ریت میں گھنگھور گھٹا برس برس جائے۔ فضل کا سارا جسم مارے مار کے دکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی زبان ابھی تک چٹخارے لے رہی تھی۔ اور یہی چٹخارہ اور یہی ذائقہ اک مرہم کی طرح اس کے سارے اعضا میں گھوم رہا تھا۔ اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہو کے اس کے درد کو پگھلا رہا تھا۔ اس کے دکھ کو ملائی کی طرح نرم اور ملائم بنا رہا تھا۔ اس کے شانے چھل گئے تھے اور پیٹھ سوج گئی تھی۔ لیکن بریانی کا سلونا ذائقہ اس کی زبان ہی پر نہیں تھا۔ ہر زخم کی زبان پر تھا۔ جیسے اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کلمہ شکر پڑھ رہا ہو۔

معاملہ چوری تک رہتا تو شاید فضل ابھی یتیم خانے سے اتنی جلدی نہ نکالا جاتا۔ لیکن اس نے ایک اور بہت بڑی حرکت کی۔ وہ اب بھیک مانگ کر لائے پیسوں میں سے دو چار پیسے بچا کر رکھ لیتا تھا۔ اور بھنی ہوئی مونگ پھلی اور گرم گرم چبینا پیسوں کا لے کے کھاتا۔ دو ذہین اور یتیم بھی اس کی دیکھا دیکھی ایسا کرنے لگے۔ آخر مینجر کو اس کا پتہ چل گیا۔ اب اسے کوئی مینجر کیسے برداشت

کر سکتا ہے کہ اس کی امانت میں خیانت ہو۔ یعنی بھیک کا پیسہ جو یتیم خانے کی میراث ہے۔ یوں آوارہ لڑکوں کے پیٹ ہی چلا جائے۔ جب وہ مجرموں کو جی بھر کے پیٹ چکا تو اس نے فضل اور دوسرے چار پانچ لڑکوں کو یتیم خانے سے نکال باہر کیا۔ اس پٹکائی میں فضل کی ایک آنکھ جاتی رہی۔

پہلے چند روز تو فضل کے ساتھیوں نے فضل کی ہر طرح سے مدد کی۔ وہ اُسے اٹھا کے ریلوے پل کے نیچے لے گئے۔ یہاں اس کی تیمارداری شروع ہوئی۔ آنکھ سے خون بہتا تھا۔ چنانچہ اس پر کوئلہ پیس کے ڈالا گیا جب خون بند ہوا۔ تو کسی کے کہنے پر گوبر تھوپا گیا۔ اور گارا مٹی چونا جو کسی نے کہا لگا دیا گیا۔ تھوڑے دنوں میں آنکھ سے خون بہنا بند ہوا۔ اور پیپ بہنی شروع ہوئی۔ اور فضل کو پھنکا کے بخار چڑھا۔ اور اس نے آئیں بائیں شائیں ہذیان میں بکنا شروع کیا۔ تو اس کے یتیم خانے کے ساتھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور شہر کے مختلف گلی کوچوں میں اپنے پیٹ کا دھندا کرنے لگے۔

فضل دو تین روز اسی طرح پل کے نیچے پڑا رہا۔ اُس وقت اس کی عمر سات سال کی تھی۔ حیرت ہے کہ وہ اس وقت مرا کیوں نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا اب تک دس بار مر چکا ہوتا۔ لیکن وہ کمبخت ایک بار بھی تو نہیں مرا۔ ہاں قریب المرگ ضرور تھا وہ۔ اور اس حالت میں رحمان نے اُسے ریلوے پل کے نیچے پڑا پایا۔ رحمان اس وقت اپنی اک یار گھاٹن کے ساتھ ریلوے کے پل کے نیچے کسی تنگ و تاریک کرنے کی تلاش میں تھا۔ کہ اس نے اس سات سال کی نیم مردہ لونڈے کو کراہتے ہوئے دیکھا۔ اور رنجانے اس کے

دل میں اُس وقت کیا خیال آیا۔ حالانکہ ایسے وقت میں کوئی شریف اور نیک خیال مشکل ہی سے ذہن میں آتا ہے۔ مگر نجانے کیا چیز اس کے دل میں اُس وقت سما گئی کہ وہ اس وقت اپنے جنسی جذبے کی شدت کو بالکل ہی بھول گیا اور پھر وہ اور وہ اس کی یار گھاٹن دونوں نے مل کے نصل کو وہاں سے اٹھایا اور رحمان کی گلی تک اٹھاتے ہوئے لے آئے۔ یہاں آن کر گھاٹن تو رفو چکر ہو گئی۔ اور رحمان نے اکیلے ہی اُسے اپنے کاندھے پر لادا۔ اور گھر پہنچ کر بیوی کی گالیاں سنتے سنتے اُسے اپنے بستر پر لٹا دیا۔

رحمان کوئی لکھ پتی نہ تھا۔ وہ آصفیہ آرٹ پریس میں مزدوری کرتا تھا کوئی بہت اچھا مزدور بھی نہ تھا۔ پچاس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ جس میں سے ہر بار آٹھ روپے اپنی یار گھاٹن کو دے دیتا۔ یہ آٹھ روپے اس کے بیوی بچوں کے سو کام آ سکتے تھے۔ مگر یہ لت اس میں تھی اور جاتی نہ تھی۔ پھر وہ کبھی کبھار تاڑی بھی چکھ لیتا۔ اور تاڑی کے نشے میں سرشار ہو کر بکارنے لگتا، اور ضرور کسی نہ کسی سے لڑائی جھگڑا کرتا۔ تین چار بار حوالات میں رہ آیا تھا۔ چھ سات بار پریس کے منیجر سے پٹ چکا تھا۔ اور بعد میں گھر جا کر اپنے بیوی کو پیٹ چکا تھا۔ اور بیوی اپنے بچوں پر برس پڑی تھی۔ اور بچے روتے روتے خاموش ہو گئے تھے۔ اور پھر رحمان بھی رونے لگا تھا۔ اور اس کی بیوی بھی رونے لگی تھی۔ اور پھر وہ دونوں رو رو کر خاموش ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ فرشتے نہ تھے کہ اپنے رونے اور خاموش ہو جانے اور دوسرے روز پھر اسی منیجر کے سامنے سر جھکا کر کام کرنے کے لئے چلے جانے کے اسباب

کو سمجھ سکتے۔

رحمان نے اگلے تین ماہ میں فضل کی بیماری پر پونے بائیس روپے خرچ کئے۔ اس کی اہمیت وہ لوگ کیا جانیں جو پورے ہسپتال کی تعمیر کا خرچ ایک لمحے میں اپنی جیب سے دے دیتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کی کوفت کا اندازہ خود رحمان ہی کو تھا۔ پہلے ماہ اُس نے تاڑی نہیں پی۔ دوسرے ماہ اس نے اپنی یار گھاٹن کو پیسے نہیں دیئے اور وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ تیسرے ماہ اس کی بیوی چاندی کی بالیوں کے لئے ضد کرتی رہی اور اس نے وہ پیسے فضل کی نقلی آنکھ پر صرف کر دیئے۔ کئی بار اس دوران میں رحمان کا جی چاہا کہ وہ فضل کو گھر سے نکال کر باہر سڑک پر چھوڑ آئے۔ مگر ہر بار وہ یہی سوچ کر رک گیا۔ کہ اب اس کو لایا ہوں۔ اور یہ اچھا بھی ہو رہا ہے۔ بالکل اچھا ہو جائے تو سالے کو مکان سے نکال باہر کروں۔

مگر جب فضل بالکل اچھا ہو گیا اور رحمان نے دیکھا کہ وہ کس قدر بھوکا ہے اور کس طرح بے بس ہو کر کھانے کی طرف دیکھتا ہے۔ تو رحمان نے یکایک فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اسے اپنے گھر میں رکھے گا۔ اُسے اپنا بیٹا بنا لے گا۔ اللہ کی مہربانی سے اس کے گھر میں اولاد کی کمی نہ تھی۔ سات بچے تھے۔ اور آٹھویں کی امیدواری تھی۔ مگر پھر بھی فضلو بھی اک بیٹا بن کر اس گھر میں رہ سکے گا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ دیکھ جتنا کھانا تو پکائے پہلے سالے کا سارا کھانا فضلو کے سامنے رکھ دیا کر۔

پاگل ہو گئے ہو۔

توکر تو بھی جیسے میں کہتا ہوں

بیوی نے ایسا ہی کیا - اور فضلو نے اتنا کھایا اتنا کھایا کہ اس کی آنکھیں باہر نکلنے کو آئیں - دوسرے روز اس نے پہلے دن سے کم کھایا - تیسرے روز اس سے کم - اور چوتھے روز اس نے خود بخود ہات کھینچ کر کھانا شروع کر دیا رحمان بڑا خوش ہوا - اس نے فضل کو لے جا کے مکتب میں داخل کر دیا - مگر کچھ تو ملاجی کا ڈر اس قدر اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا - دوسرے شب و روز مار کھا کے اور بھوکا رہ کے اس کے ذہن کی گرہیں اس قدر سپاٹ ہو گئی تھیں کہ آٹھ سال مکتب میں پڑھ کر وہ چوتھی جماعت سے آگے نہ چل سکا - آخر تنگ آ کے رحمان نے فضل کو مکتب سے اٹھا لیا - مکتب سے خلاصی پا کے فضل دو چار روز بہت خوش رہا - پھر وہ گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گیا - اب وہ برتن مانجتا تھا - بازار سے سودا سلف لاتا - لڑکوں کے ساتھ دوسرے گلی محلے کے لڑکوں سے لڑائی جھگڑا کرتا - نت نئی گالیاں سیکھتا - اور کبھی کبھار رحمن کے ڈانٹنے پر بھنی ہوئی مونگ پھلی اور سنگھاڑے بیچنے کے لئے شہر میں نکل جاتا - لیکن حساب میں اس قدر کچا تھا کہ کبھی پورے پیسے گھر نہیں لایا سنگھاڑے آنے کے دو ملتے تھے - یہ کبھی آنے کا ایک دیتا، تو کبھی چار - کبھی گاہک سے پاؤ بھر مونگ پھلی کا ایک آنہ لے کے اُسے دو آنے واپس کر دیتا اور کبھی گاہک سے پیسے لے کے بھول جاتا اور پیسوں کا تقاضہ کرنے پر بری طرح پٹتا - کئی بار پولس کے سپاہی اس کی ٹوکری اٹھا کر لے گئے - اور اُسے بھی حوالات میں بند کر دیا - اور ایک بار تو اسٹیشن کے ناکے کے مشہور

غنڈے نے اُسے اپنا لونڈا بنانے پر قریب قریب راضی کر لیا تھا۔ اور اُسے ایک ریشمی رومال بھی پیش کیا تھا۔ جب فضلو یہ سرخ ریشمی رومال لئے گھر پہنچا۔ اور جب رحمان کو پتہ چلا کہ سرخ رومال فضلو کے ہات میں کہاں سے آیا ہے۔ تو اس نے اسٹیشن کے ناکے پر جا کے غنڈے کی وہ خبر لی کہ پولس والوں کو بیچ بچاؤ کرنا پڑا۔ اور رحمان کے لئے پندرہ روپے جرمانہ یا سات دن کی قید کی سزا تجویز ہوئی۔ جب جا کے اس کی بیوی نے اپنے کانوں کے زیور اور ہاتوں کے چھلے بیچے۔ اور نیا لحاف جو سردیوں کے لئے بنا تھا۔ پٹھان کے ہاں گروی رکھا۔ اور رحمان کو رہائی نصیب ہوئی۔

دو سال اسی طرح آوارہ گھومنے کے بعد فضل، رحمان کی سفارش سے آصفیہ آرٹ پریس میں نوکر ہو گیا۔ اب اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، جوانی رگ و پے میں لہریں لے رہی تھی۔ اس کے بے ڈول سے مضبوط ہات اس کی مضبوط ٹانگیں۔ اس کے کھردرے موٹے موٹے سے ننگے پاؤں کام کرنے کے لئے حرکت کے لئے، زور لگا کر کوئی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے بے تاب نظر آتے تھے۔ اب یہی اعضا آصفیہ آرٹ پریس میں بارہ روپے پر نوکر ہو گئے۔ اور کھٹا کھٹ مشین کی طرح کام کرنے لگے۔ کام کرتے کرتے جب کبھی فضل کو بارہ روپوں کا خیال آتا تو اس کے ذہن میں پھریری سی آجاتی سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ چیونٹیاں سی روئیں روئیں میں ٹھونگیں مارنے لگتیں۔ بارہ روپے، بارہ روپے، بارہ روپے۔ جب وہ کام کر کے باہر نکلتا۔ تو یہی بارہ روپے اسے چاروں طرف پھیلے ہوئے نظر آتے۔

اب وہ ایک قمیض خرید سکتا تھا۔ ایک پاجامہ یا ایک نیکر۔ وہ انگریزی وضع کے بال بنوائے گا۔ اور۔ اور ہاں وہ اب بازار سے مٹھائی بھی خرید سکتا ہے تنخواہ ملے گی تو وہ دو درجن سنگترے خریدے گا۔ اور یو پی ریسٹورنٹ میں جا کے بریانی کی پانچ پلیٹیں کھائے گا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ پریس میں بڑی مستعدی سے کام کرنے لگتا۔ اور کام کرتے کرتے گنگنانے لگتا۔ اور سارے مزدور کہتے۔ ابھی نوجوان ہے۔ کچا ہے۔ منجھ جائے گا۔ تو اس طرح گنگنائے گا نہیں۔ شادی بھی نہیں ہوئی۔ سر پر بوجھ نہیں ہے۔ گا سکتا ہے۔ ورنہ یہ دنیا کوئی گانے کی جگہ تھوڑی ہے۔

پھر ایک دن فضل کی نگاہ مینجر کے نئے جوتے پر پڑی۔ بڑا اچھا جوتا تھا براؤن رنگ کا بروگ جوتا۔ اور تلے پر دُہرا ربڑ لگا ہوا۔ اور اس قدر چمکدار کہ آدمی اپنا منہ بھی اس میں دیکھ لے۔ فضل نے یہ جوتا دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ اور کتنے ہی عرصے تک اُسے دیکھتا رہا۔ اور جہاں جہاں مینجر جاتا۔ یہ اس کے جوتے کو دیکھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ حتیٰ کہ مینجر کو اُسے ڈانٹنا پڑا۔ اب جا کے فضل کو کہیں ہوش آیا۔ اور وہ اپنے کام میں مشغول ہوا۔ لیکن اس وقت اس کا جی اپنے کام میں نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں وہی خوبصورت جوتا گھوم رہا تھا۔ کتنا خوبصورت نرم و نازک جوتا تھا وہ۔ انھیں پاؤں میں پہن کر آدمی بہشت ہی میں تو پہنچ جاتا ہو گا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جوتا اُٹھا کر اپنے گالوں سے لگا لے پھر فضل نے اپنے بڑے بڑے کریہہ منظر پاؤں کو دیکھا۔ پھٹے پھٹے سے مکروہ پاؤں۔ جو ننگے چلنے سے چپٹے ہو گئے تھے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اس نے

آج تک کبھی جوتا نہیں پہنا۔ اُسے آج تک کبھی جوتا نہیں ملا۔ لیکن اب وہ ضرور جوتا پہنے گا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ اب وہ جوتا ضرور پہنے گا۔ براؤن جوتا۔ خوبصورت بروگ۔ دہرے ربڑ کا تلا۔ آئینے کی طرح چمکتا ہوا جوتا ...

اس نے رحمان سے کہا "چاچا میری تنخواہ دلا دو"

رحمان نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کہا "ارے ابھی دس روز تو ہوئے ہیں تجھے کام کرتے ہوئے۔ تنخواہ کیسی۔ کیسی باتیں کرتا ہے"

چاچا دس روز کی میری تنخواہ کیا ہوتی ہے

چار روپے

تو چار روپے ہی دلا دے مجھے۔ آج ہی دلا دے

کیا کرے گا چار روپوں کو

یکایک فضل چپ ہو گیا۔ اور فوراً جواب نہ دے سکا۔ کسی غیر معمولی جذبے کے زیر اثر اس کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا۔

رحمان نے پھر پوچھا "کیا کرے گا چار روپے لے کر"

فضل کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔ وہ رکتے رکتے بولا "چاچا ... میں ... جوتا پہنوں گا"

رحمان ہنسنے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فضل کو منیجر کے پاس لے گیا۔ اور اُسے ساری کہانی سنائی۔ اب منیجر اتنا ہنسا کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ لیکن آخر میں فضل وہاں سے چار روپے لیکے ہی ٹلا۔

منیجر نے کہا۔ دیکھا۔ لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ سب مزدور ایسا ہی کرتے ہیں۔ جب آتے ہیں تو ننگے پاؤں۔ پھٹے کپڑے پہنے ہوئے بھوکے آتے ہیں۔ پھر جب تنخواہ ملتی ہے تو پر پرزے نکالنے لگتے ہیں۔ پہلے جوتے پہنتے ہیں۔ پھر قمیض اور نیکر۔ پھر ٹوپی۔ پھر تنخواہ بڑھانے کا تقاضہ شروع کرتے ہیں۔

رحمان نے چڑکر کہا: اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ آدمی کا بچہ ہے۔ ترقی کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی ہوتے ہوتے ایک قدم کے آگے دوسرا قدم بڑھتا ہے۔"

منیجر نے کہا: ہاں۔ ہاں۔ میں کب کہتا ہوں۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک قدم کے آگے دوسرا قدم آہستہ آہستہ بڑھاتے جاؤ تو کسی کو کیا اعتراض ہے۔ مگر ہر چیز اعتدال سے ہو تو اچھا ہے۔

رحمان غور سے منیجر کے جوتے کی طرف دیکھنے لگا۔

منیجر نے کہا۔ یہ میں نے ایک چینی موچی سے تیار کروایا ہے۔ سالے نے پورے چالیس روپے ہتیا لئے اس کے۔

× × ×

فضل چار روپوں کو داہنے ہاتھ کی ہتیلی میں دابے بازار میں چلا جا رہا تھا۔ جوتوں کی دکانوں پر بار بار رکتا۔ اور اپنا محبوب جوتا ڈھونڈ نکالتا پیسے پوچھتا۔ تو جواب ملتا۔ چالیس روپے۔ یا انتالیس روپے پندرہ آنے!

وہ جوتا کہیں بھی چالیس روپے یا انتالیس روپے پندرہ آنے سے کم میں دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ اور اس کے پاس صرف چار روپے تھے۔ اور اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھتا گیا۔ اب یہ کیسے ہوگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس ماہ وہ ایک جوتا خریدے گا۔ دوسرے ماہ ایک قمیض اور نیکر۔ تیسرے ماہ ایک ٹوپی۔ چوتھے ماہ ایک لحاف، پانچویں ماہ ... ... لیکن ابھی تو وہ یہ جوتا ہی کیسے خرید سکے گا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔

اس نے رنجیدہ ہو کے سوچا۔ چلو کوئی اور جوتا ہی دیکھیں۔ کوئی کم داموں ہی میں مل جائے۔

جوتا۔ تیس روپے۔ جوتا۔ پچیس روپے۔ جوتا۔ بیس روپے۔ جوتا اٹھارہ روپے۔ جوتا گیارہ روپے۔ جوتا۔ نو روپے آٹھ آنے۔ جوتا سات روپے ... ... جوتا۔ چار روپے کا کہیں نہ تھا۔ سارے شہر میں کہیں نہ تھا۔

مایوس ہو کے فضل گھر کو لوٹ رہا تھا کہ چوبازار کے نکڑ پر فٹ پاتھ پر سجے ہوئے جوتوں میں اُس نے وہی جوتا دیکھا۔

جوتا وہی تھا۔ براؤن برونگ۔ مگر پرانا

وہی دوہرے ربڑ کے تلے تھے۔ مگر گھسے ہوئے۔ اور ان میں سخت شکنیں ہوئی تھیں۔

جوتا وہی تھا۔ لیکن اس چمڑے کی آب و تاب جا چکی تھی۔ اس گدلی رنگت میں چہرے کا عکس کون دیکھ سکتا ہے۔

تسمے غائب تھے مگر جوتا وہی تھا۔

فضل نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا: اس جوتے کے کیا دام ہوں گے۔

دس روپے

میرے پاس چار روپے ہیں

نکالو۔ چار ہی سہی۔ تم بھی کیا یاد کروگے۔ کسی سیٹھ کا جوتا پہنا تھا لے جاؤ اسے۔

جوتا پہنتے ہی فضل وہاں سے بھاگا۔ مبادا کوئی اس سے جوتا نہ چھین لے۔ وہی براؤن بروگ۔ وہی دوہرے ربڑ کا تلا بے آواز جوتا۔ فضل کو معلوم ہوا جیسے وہ مخمل کے فرشتس پر گھوم رہا ہے۔ آج اس نے پہلی بار جوتا پہنا ہے۔ کل وہ نئے کپڑے مول لے گا۔ پرسوں ایک ٹوپی۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم آگے بڑھاتے ہوئے آگے بڑھتا جائے گا۔ اب وہ جی لگا کر پریس میں کام کرے گا۔ کبھی مینیجر کا حکم نہیں موڑے گا۔ پہلی بار زندگی میں اس نے سچے دل سے دعا مانگنا چاہی۔ اور وہ دوڑتے دوڑتے قریب ہی ایک مسجد کے پاس رک گیا۔ اور اندر چلا گیا۔

جب وہ مسجد سے باہر نکلا تو جوتا غائب تھا۔ وہ رات بھر اپنے جوتے کے لئے روتا رہا۔ جیسے اس کا محبوب اس سے جدا ہو گیا ہو۔ یا اس کا باپ مر گیا ہو۔ وہ دھاڑیں مار مار کے رویا۔ اس پرانے بروگ کے لئے۔ جیسے جہان بھر کی امیدیں اس کے لئے خاک میں مل گئی ہو۔ جیسے زندگی کی ساری خوشیاں آگ کی چنگاری سے خاکستر ہو گئی ہوں۔

رحمان نے اُس روز پھر تاڑی پی رکھی تھی۔ اُس نے فضل کو خوب پیٹا۔ تو بروگ پہننا چاہتا ہے۔ تجھ پر خدا کی مار۔ جب تلک مالک موجود ہے مجبور مجبور ہی رہے گا۔ وہ مالک نہیں بن سکتا۔ وہ بروگ نہیں پہن سکتا۔ وہ نئے کپڑے نہیں سلا سکتا۔ اس کی ٹوپی غائب رہے گی۔ اس کا سر جھکا ہوا ... سمجھتا ہے سب ... ...

اُس نے فضل کی کمر میں ایک گھونسا رسید کیا۔ کبھی میں بھی تیری طرح سوچتا تھا۔ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم۔ آج جوتا ہے۔ تو کل قمیض ہے پرسوں ٹوپی ہے۔ تو اترسوں کیا چھپر ہے۔ سب بکواس ہے۔ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اور اس کے بعد پھر وہی پہلا قدم ہے۔ ایں۔ سمجھتا ہے تو، مالک ایک داؤ میں طرح دیتا ہے۔ دوسرے داؤ میں سب کچھ چھین لیتا ہے۔

سب کچھ ... سب کچھ ... یہ کہہ کے اس نے فضل ایک چانٹا اور رسید کیا۔ اور بولا ... یہ قدم قدم بڑھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بروگ کا خیال دل سے نکال دے۔ ننگا بھوکا پیاسا رہ۔ مگر ایک ہی چھلانگ میں میدان میں کود جا۔ اور ایک ہی جست میں منزل کو پالے ... سالے!

رحمان بولتا چلا جا رہا تھا اور فضل کو برابر پیٹے جا رہا تھا۔ مگر فضل پر اب جیسے اس مار کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے دماغ سے جیسے کہرا یکایک صاف ہو گیا۔ جیسے ہر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ واضح، قاطع، جچی تلی ...

"باتیں"

باتیں بنانا بھی دراصل ایک فن ہے۔ اس فن کا مظاہرہ اکثر ٹراموں میں، بسوں میں، لوکل گاڑیوں میں، جلسوں میں، بڑی مجلسوں میں، ہوٹلوں میں الغرض جہاں جہاں بھی انسانی مخلوق کثرت سے چلتی پھرتی کھاتی پیتی ہنستی بولتی نظر آئے، ہوتا رہتا ہے۔

برسوں کا ذکر ہے۔ میں ٹرام میں سوار ہوا، گرگام جانے کے لئے، چھوٹتے ہی ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے مجھے نہایت خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر کہا: "کیوں جی۔ یہ ہماری سرکار حیدرآباد پر حملہ کیوں نہیں کرتی"

میں نے کہا: "کیوں حملہ کرے جی"

"لو سنو" ادھیڑ عمر کے آدمی نے آس پاس کے لوگوں کو سنا کے کہا۔

"بابو جی حیدرآباد پر حملہ کرنے کے خلاف ہیں"

اس پر دو چار لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے، بھنا کے بولے "آپ حیدرآباد پر حملہ کرنے کے خلاف ہیں؟"

"یہ میں نے کب کہا، حملہ کل ہوتا ہو آج ہو جائے"

"آج کیسے ہو جائے" ادھیڑ عمر کے آدمی نے غصے سے ٹرام کی کھڑکی پر مکہ مار کے کہا "ہماری سرکار بے وقوف نہیں ہے"

اس کے حمائیتیوں نے بھی کھڑکیوں پر مکے مار کر میری طرف غصہ سے دیکھ کے کہا "ہماری سرکار بے وقوف نہیں ہے سمجھے آپ"

"ٹھیک ہے۔ کنڈکٹر مجھے اگلے موڑ پر اتار دینا" میں نے جلدی میں کہا

ادھیڑ عمر کا آدمی چیخ کر بولا "بے وقوف تو نہیں ہے۔ مگر کشمیر میں کیا ہو رہا ہے یہ معاملہ لمبا ہوتا جا رہا ہے"

"لمبا ہوتا جا رہا ہے؟" باقی لوگ اس سے پوچھنے لگے۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے پان کی پیک زور سے ٹرام کے باہر چلتے ہوئے لوگوں پر پھینک کر کہا "یو۔ این۔ او کمیشن کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا پہلے اس انڈونیشیا کمیشن نے کیا کر دیا۔

"کیا کر دیا"؟ لوگوں نے پوچھا

ادھیڑ عمر کے آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر بولا "فلسطینی کمیشن نے بھی کیا کیا"

"کیا کیا؟" لوگوں نے پھر پوچھا۔ پھر کوئی جواب نہیں ملا۔

"اب کشمیر کمیشن بھی کیا کرے گا۔ کشمیر ہندوستان میں ہے۔ کشمیر ہندوستان میں رہے گا"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ سارد چھے" چند گجراتی چھکے بس نے کہا: "اور کشمیر ہندوستان میں ہے اور ہندوستان ایشیا میں ہے اس لئے کشمیر ایشیا میں رہے گا اور ایشیا دنیا میں ہے۔ اور دنیا اس کائنات میں ہے اس لئے کشمیر اس کائنات میں رہے گا۔"

ادھیڑ عمر کے آدمی نے زور سے کھڑکی پر ہاتھ مار کے کہا: "نہیں، کشمیر اس کائنات میں نہیں رہ سکتا۔"

لیکن موڑ آگیا ہے جہاں مجھے اترنا تھا۔ میں اتر گیا۔ اترتے اترتے میں نے کنڈکٹر کو ادھیڑ عمر کے آدمی سے یہ کہتے سنا: "اب اگر تم نے کھڑکی پر زور سے ہاتھ مارا تو میں تمھیں ٹرام سے نیچے اتار دوں گا"

"ارے بھائی" ادھیڑ عمر کا آدمی بولا: "میں تو یوں ہی بابو جی سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ تو یوں ہی خفا ہو کے چلے گئے"

× × × × ×

ٹرام سے اتر کر بس میں بیٹھا۔ تو میرے ساتھی نے کہا: "اس بس پر بڑا خطرہ ہے"

"ہائیں!" میں نے گھبرا کر کہا: "کاہے کا خطرہ ہے"

"الٹ جاتی ہے" میرے ساتھی نے کہا

"کیا؟" میں نے اور بھی حیران ہو کے پوچھا: "کیا الٹ جاتی ہے؟"

اُس نے انگلی سے اشارہ کرکے کہا "یہی بس ۔ یہ دو منزلہ بسیں اُلٹ جاتی ہیں آج کل۔ پچھلے دنوں دو حادثے ہو چکے ہیں ۔ دونوں حادثے دن کے نو بجے ہوئے تھے ۔ اب نو بجا چاہتے ہیں ۔ آپ کہاں جائیں گے ؟"

"دوبئی" میں نے کہا

"تو بس یہ بس دوبئی پر اُلٹے گی"

"تو میں اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤں گا"

"نہیں ۔ نہیں ایسا نہ کیجیے ۔ ممکن ہے یہ بس نہ الٹے آپ کو معلوم ہے یہ بس کیوں الٹتی ہے دراصل"

"کیوں الٹتی ہے"

"اس کے متعلق دو رائیں ہیں"

"دو رائیں ہیں ۔ یہاں پر بھی دو رائیں ہیں"

"ہاں ایک رائے تو یہ ہے کہ زمین گول ہے ۔ اور بس اس کی سطح پر عمود گراتی چلتی ہے"

"اور اسی کوشش میں خود بھی گر جاتی ہے" میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا

"نہیں ۔ نہیں ۔ تم نرے بے وقوف ہو" اس نے مجھ سے بے اختیار کھلتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ تم عمود نہیں جانتے ہو؟"

"نہیں"

"زاویہ قائمہ ؟"

"نہیں"

"زاویہ منفرجہ؟"

"نہیں"

"کہاں پڑھتے ہو؟"

"ناروودال ۔ضلع سیالکوٹ ۔صوبہ مغربی پنجاب ۔ ملک پاکستان"

"توتم پاکستانی ہو؟"

"ہاں"

"تو یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"بنیر لئے کرنے"

اس نے بلیڈ سے اپنے ناخن چھیلتے ہوئے کہا: "اپنے ملک چلے جاؤ" اور اس نے بلیڈ میری آنکھوں کے آگے گھمایا۔

"میں جاتا ہوں" میں نے سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے کہا

"نہیں بیٹھو، ہم اتنے بُرے نہیں۔ اور میرا تو مسلک ہے۔ محبت، انسانیت بلاتفریق مذہب و ملت، دو بتی میں کہاں رہتے ہو۔ کیا کرنے ہو۔ کیوں کرتے ہو کیوں رہتے ہو؟"

میں نے کہا: "اور آپ کی وہ دو رائیں۔"

"کون سی؟"

"بس الٹ جانے کے متعلق"

"ہاں تو ایک رائے یہ ہے کہ اگر بس سڑک سے زاویۂ قائمہ بنائی ہوئی چلے تو گر جائے گی۔ سیدھی جیسے عمود ——— مگر تم عمود کو نہیں جانتے ہو"

میں نے کہا: "میں عمود کو نہیں جانتا ہوں، مگر اس کے باپ سے مل چکا ہوں"

"کب، کہاں، کیسے؟"

"عمود کا باپ ملبار ہل پر رہتا ہے۔ وہ بنی کے آگے ان کی کوٹھی ہے۔ جو حاجی ہے وہی نا۔ اسی کا ذکر کرتے ہو نا تم"

"وہ بولا: "تم نرے کورے ہو۔ عمود تو جیومیٹری کی ایک اصطلاح ہے وہ حاجی نہیں ہے۔ تم نے جیومیٹری پڑھی ہے۔ کاہے کو پڑھی ہو گی۔ خیر تو سنو۔ اگر بس عمود کے بجائے منفرجہ ۵، درجے کا بنائے تو ہر وقت زمین کی کشش ثقل اور وہ منزلہ بس کے مرکز ثقل میں ۵، درجے کا تفاوت رہے گا۔ جس سے بس کبھی نہیں گرے گی۔ مگر یہ بس ضرور گرے گی۔ کیوں پوچھو"

"میں نہیں پوچھتا"، میں نے کہا: "تم خود ہی بتاؤ"

"میں بتا دیتا ہوں تمھیں۔ جب میں بس میں سوار ہوا تو میں نے دیکھا کنڈکٹر سیدھا تنا کھڑا ہے عمود گرائے ہوئے۔ بس سیدھی کھڑی ہے زاویہ قائمہ بنائے ہوئے۔ ڈرائیور اکڑا بیٹھا ہے۔ میں نے سوچا یہ بس ضرور گرے گی"۔۔۔۔ کہاں؟ تم پوچھو"

میں چپ رہا

"دو بنی کے پاس، تم پوچھو وہاں کیوں؟"

میں پھر بھی چپ رہا۔

"وہ آپ ہی آپ بولا: "اس لئے کہ وہاں پر سڑک اونچی ہوتی جاتی ہے

وہ زور زور سے چلّانے لگا۔ "اونچی ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دوبئی کے پاس زمین کا زاویہ سڑک کے زاویہ سے عمود گرانے لگتا ہے"

میں نے گھبرا کر کہا: "پھر عمود؟"

"ہاں" اُس نے چلّا کر کہا: "زمین سڑک سے عمود بدرجہ زاویۂ قائمہ گرانی جاتی ہے"۔

"اور ادھر یہ بس چلی آتی ہے" میں گھبرا کر بولا۔

"وہاں دوبئی کے پاس دونوں زاویہ ہائے قائمہ مل جاتے ہیں۔ اور بس الٹ جاتی ہے"

کنڈکٹر نے قریب آ کے ٹکٹ پوچھا: "کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "دوبئی کے دو ٹکٹ"

وہ بولا: "کیوں؟"

"آپ بھی میرے ساتھ دوبئی جائیں گے۔ آپ کو چلنا پڑے گا" میں نے اسے شانے سے پکڑ لیا۔

وہ ہنس کر بولا: "میں تو یوں ہی باتیں ملا رہا تھا۔ مجھے تو صرف اوپیرا ہاؤس جانا ہے۔ یہ بس بالکل ٹھیک ہے۔ اس کا عمود ... ... "

× × × × ×

بس سے اتر کر ہوٹل میں پہنچا۔ تو لاؤنج میں سیٹھ بیگ چند مل گئے۔ سیٹھ بیگ چند کا رنگ سیاہ ہے۔ بال بھی سیاہ۔ اور ننھی ننھی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں بالکل سیاہ۔ پتلے پتلے ہونٹوں کا دہانہ دونوں جبڑوں تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ پان کھانے

کھانے کے عادی کہ پتلے پتلے لمبے ہونٹوں پر پان کی سرخی ایسے معلوم ہوتی ہے گویا کسی نے پہرے پر سرخ رنگ کی زپ (زپ) لگا دی ہے ۔ لیکن زپ تو پھر کسی وقت بند ہو جاتی ہے لیکن سیٹھ بیگ چند کا منہ کسی وقت بند نہیں ۔ ہر وقت باتیں ملاتے رہتے ہیں اور ہر بات میں ننانوے فی صدی کا ذکر ضرور ہو گا ۔ اور پھر یار لوگ تو باتیں ملانے میں دو دن کی لیتے ہیں ۔ یہ ہمیشہ تین کا ذکر کرتے ہیں ۔

میں نے کہا سیٹھ صاحب ۔ وہ میرے روپوں کا بندوبست ہو گیا ؟"

"ارے اس میں کیا ہے ۔ روپے کا بندوبست بھی کوئی مشکل چیز ہے جب چاہو ہو جائے"

"تو پھر کب ہوتا ہے کل ؟"

"کل نہیں تین دن کے اندر ہو جائے گا"

"ہو جائے گا ؟" میں نے پوچھا

"ہو جائے گا ۔ ننانوے فی صدی ہو گیا سمجھو"

"ایک لاکھ کی تو بات ہے سیٹھ صاحب"

"ارے ایک لاکھ کیا ۔ تم تین لاکھ لو نہ جی"

"تین لاکھ کیوں لوں"

"بھلے مانس عقل کی سوچو ۔ اگر بزنس میں گھاٹا پڑ جائے تو پھر کیا کرو گے ۔ تین لاکھ میں ٹھیک رہے گا ۔ احتیاط لازم ہے"

"اچھا چلئے تین لاکھ ہی سہی" میں نے قناعت کرتے ہوئے کہا

اس کے بعد میں نے کہا "تو چلئے وہسکی کی ایک بوتل کھولئے جشن ہو جائے"

"ارے ایک بوتل کیا۔ تین بوتلیں حاضر ہیں۔ تمھارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔ ارے بھائی ہم ایسے ویسے مارواڑی نہیں ہیں۔ دل رکھتے ہیں دل۔ جو ایک دفعہ سوچ لیا۔ کر لیا۔ تم ہی دھرم سے کہو۔"

میں نے کہا "کیا کہوں دھرم سے"

"سیٹھ بیگ چند نے کبھی کسی کی برائی کی۔"

"نہیں"

"کسی کو نقصان پہنچایا"

"نہیں"

"کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالا؟"

"نہیں"

"دھرم سے کہو۔"

"دھرم سے کہتا ہوں"

سیٹھ بیگ چند نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اُن کی چندھیائی ہوئی ننھی سی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ایک جاپانی چوہے کی طرح ہنس کر بولے "تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ کبھی پروگرام بناؤ نا تو جودھ پور چلیں اکٹھے"

"جودھ پور کاہے کو چلیں"

"تمھیں روپیہ دلوائیں گے"

"جودھ پور سے۔ تم تو کہتے تھے میں روپے کل دلوا دوں گا"

"مگر یہاں روپیہ کہاں سے پیارے ـــــ ارے ہاں ہے تو سہی سیٹھ

ڈیگ چند کے پاس۔ ہوگیا بس سمجھو ہوگیا تمھارا کام" وہ تالی بجا کر بولے۔

"ہوگیا؟" میں نے پھر پوچھا

"ننانوے فی صدی" وہ بولے

میں نے کہا: "ایک لاکھ ہی چاہئے مجھے صرف"

"ارے تین لاکھ لو نہ تم"

"اور ایک فلیٹ"

"ارے تین فلیٹ لو نہ تم یار"

"اور ایک کار"

"ارے تین کاریں لو نہ تم بھی"

بس اسی طرح سے باتیں ملاتے جائیں گے۔ کیا مجال جو سیٹھ بیگ چند کبھی چوک جائیں۔ آپ ایک لاکھ مانگئے۔ وہ تین لاکھ دیں گے۔ آپ ایک فلیٹ کا ذکر کیجئے۔ وہ تین فلیٹ دلوانے پر تیار ہوں گے مگر دلوائیں گے کچھ بھی نہیں۔ بس باتیں ملاتے جائیں گے آج بھی جب وہ بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ اور کوئی کام کی بات نہیں ہوئی تو میں نے کہا: "وہ بوتل نہیں آئی"

"ارے ایک کیا تین منگاتا ہوں"

"باہر سے منگاؤ گے۔ کمرے میں نہیں ہیں کیا؟"

"ہوں گی ضرور ہوں گی ننانوے فی صدی"

× × × × ×

باتیں سنتے سنتے رات کے دس بج گئے۔ ہم لوگ بھوکے پیاسے باتیں سنتے

رہے اُن کی۔ اب بہت سے یار دوست اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور سیٹھ صاحب کا منہ پھٹا کر چلتا جارہا تھا۔ کوئی دو ہزار میل لمبی باتیں کی ہوں گی انھوں نے۔ آخر جب انھوں نے دیکھا کہ ساری محفل عاجز آگئی ہے۔ تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے بولے "میں چلتا ہوں ایک ٹیکسی منگوا دو"،

میں نے کہا "ایک نہیں تین منگاتا ہوں"

وہ حیرت سے بولے "تین کیوں"،

میں نے کہا "اگر راستہ میں ایک فیل ہو جائے اور کبھی سیٹھ صاحب آپ جانتے راستہ ہی تو ہے راستے کا کیا بھروسہ۔ آپ تینوں ٹکسیاں لیتے جائیے اگر ایک فیل ہو جائے تو دوسری۔ دوسری فیل ہو جائے تو تیسری۔ بلکہ میرے خیال میں تو آپ تین ٹیکسیاں، تین گھوڑا گاڑیاں اور تین چھکڑے لیتے جائیے۔ راستے کا کیا بھروسہ ہے۔ احتیاطاً لازمی ہے"

سیٹھ صاحب بڑی دیر تک منہ لٹکائے ہوئے ٹیکسی کے انتظار میں بیٹھے رہے آخر بولے "ٹیکسی نہیں آئی؟"

"آ رہی ہے" میں نے کہا

"آ رہی ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ننانوے فیصدی" میں نے جواب دیا۔ سیٹھ بیگ چند غصے میں بھر کر ہوئے باہر نکل گئے۔ مگر دوسرے روز پھر اسی طرح باتیں بنا رہے تھے۔

بہار کے بعد ...

پندرہ اگست ۱۹۴۸ء کے روز ایک اخبار کی سرخی یہ تھی

چرخہ چلاؤ۔ سوت کاتو

راجن بابو کا فرمان

کانگریس کے سبھاپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ آزادی کے روز ہنگامہ نہ کریں۔ بلکہ سنجیدہ رہ ہو کے دھیان میں مگن ہو کے آزادی کا دن منائیں۔ اس روز آزادی کے منوانے چرخہ چلائیں۔ سوت کاتیں ... ...

... ... مدنپورہ میں سیٹھ یاسین بھائی کی مسجد کے پاس ایک نہایت

تاریک اور غلیظ کوٹھڑی میں کریما جلاہا رہتا تھا۔ کریما جلاہا اور اس کی بوڑھی بیوی اور اس کے پانچ بچے، سب سے بڑی بچی اٹھارہ برس کی تھی۔ اس کا نام فیروزہ تھا، کریما کو اس کے بیاہ کی بڑی فکر تھی۔ یہ فکر اسے آزادی کے روز بھی گھلائے ڈالتی تھی۔ کریما جلاہا تھا۔ زندگی بھر اس نے چرخہ چلایا تھا، کرگھے پر کام کیا تھا اور سوت کی انٹیاں گھمائی تھیں۔ یہی کام کرتے کرتے اس کی بینائی کمزور ہوگئی اور ہاتھوں میں رعشہ آگیا۔ وہ اس اندھیری کوٹھریا میں گزشتہ پچیس سال سے رہتا چلا آیا تھا۔ جب وہ جوان تھا۔ آج اس کی بیٹی جوان تھی۔ یہ کوٹھڑی وہی تھی۔ مسجد وہی تھی، گلی کا فرش وہی تھا۔ بغل میں پتنگ اور کاغذی پھول اور دکوڑیا کے گھوڑوں کے لئے کلغی بیچنے والے کی دکان وہی تھی۔ گلی سے باہر سیٹھ یاسین بھائی کا سہ منزلہ گھر تھا۔ سیٹھ یاسین بھائی جو ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے مسلم لیگی تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے پکے کانگریسی بن گئے تھے۔ اس محلے کے سارے گھر ان کے تھے۔ ان کا کرایہ بھی انہی کو جاتا تھا۔ یہ مسجد بھی انھوں نے بنوائی تھی۔ اُن کے گھر کے اندر تین بیویاں تھیں۔ گھر کے باہر گیراج میں چار موٹریں تھیں۔ جو ان کی بیویوں کی طرح ہمیشہ سجی سجائی نظر آتیں، سیٹھ یاسین بھائی کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ ہوس پچیس سے نیچے تھی جب کریما ان کے دفتر میں کوٹھڑی کا کرایہ دینے آتا۔ اور ان سے افسردہ لہجے میں اپنی مصیبت بیان کرتا۔ تو سیٹھ مسکرا کر کہتے۔ ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھاری فیروزہ کا بیاہ بھی ہو جائے گا۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا تو کریما جلاہا خوش ہو کے سیٹھ یاسین بھائی کو دعائیں دینے لگتا۔

آج آزادی کے روز کریما کے گھر میں چرخہ بھی تھا۔ اور چرخہ چلانے والے بھی۔ ہاں سوت کاتنے کے لئے روئی نہ تھی۔ مل کے کپڑے کا بھاؤ چوگنا ہو گیا تھا۔ تو روئی کا دام بھی اسی بھاؤ سے بڑھ گیا تھا۔ لیکن سوت اور ہاتھ کے سوت سے بنے ہوئے کپڑے کے دام بہت کم بڑھے تھے۔ کیونکہ ملوں کے کپڑے تو سب پہنتے ہیں۔ کھدر کون پہنتا ہے۔ اور وہ بھی ہاتھ کا بنا ہوا ایک گاندھی جی پہنتے تھے انھیں ایک ہندستانی نے مار ڈالا۔ ایک عبدالغفار پہنتے تھے۔ انھیں بھی قید کر دیا گیا ہے۔ روئی کے دام بڑھ گئے تھے۔ مل کے کپڑے کے دام بڑھ گئے تھے۔ لیکن ہاتھ کے بنے ہوئے سوتی کپڑے کے دام نہ چڑھے تھے۔ اسی لئے تو آج کریما کے گھر میں روئی نہ تھی۔ اس کے گھر میں پانچ بچے تھے۔ ایک بیوی تھی۔ اور ایک اٹھارہ برس کی بچی تھی۔ جس کا بیاہ اُسے کرنا تھا۔ لیکن اس کے گھر میں روئی نہ تھی اس لئے چراغ میں تیل نہ تھا ہانڈی میں گوشت نہ تھا۔ چولھے میں لکڑی نہ تھی۔ وہ دیر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتوں کو اوپر اٹھا کر مسجد کی طرف تکتا رہا۔ پھر اس کے ہات آہستہ سے نیچے گر گئے۔ اور اس نے فیروزہ کو آواز دی۔

"جی۔ ابا"۔ فیروزہ اپنی پھٹی اوڑھنی کو سنبھالتے ہوئے آنکھیں جھکا کے کریما کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"سیٹھ کے گھر کے اندر چلی جا۔ اور ان کی بڑی بیوی سے دو روپے مانگ لا۔ وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہیں نا۔ کہہ دینا۔ ابا اگلی جمعرات پر لوٹا دیں گے"۔

"بہت اچھا ابا"

فیروزہ چلی گئی۔ کریما حسرت اور خوف سے اس کے گدرائے ہوئے حسن کو دیکھتا رہا۔ اللہ وہ دن جلد آئے جب اس کی بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوں۔ اور وہ اپنے خاوند کے گھر چلی جائے۔ فیروزہ نظروں سے غائب ہو گئی اور کریما کی نگاہیں مسجد کے منارے کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں ایک کبوتر چکر لگا رہا تھا۔

"ابا۔ ابا۔ ہم ایک قومی پتنگ لیں گے"

یہ اس کا چھوٹا لڑکا علیم بول رہا تھا۔ اس کی عمر سات سال کی ہو گی وہ ایک پھٹا ہوا پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ قمیص اس کے پاس نہ تھی۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو البتہ قمیص پہنا کرتا تھا۔ لیکن ان دنوں اسے پائجامہ پہننے کو نہ دیا جاتا تھا۔ پانچ برس تک وہ صرف قمیص پہنتا رہا۔ جب چھٹے برس میں آیا۔ تو اسے پائجامہ پہننے کو ملا۔ اب پائجامہ تو ملا لیکن قمیص ندارد۔ علیم نے ابا سے بہت کچھ کہا سنا۔ لیکن کریما کے پانچ بچے تھے، وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ میاں یا تو قمیص پہنو یا پائجامہ۔ دونوں چیزیں نہیں مل سکتیں۔ مجھے دوسروں کا تن بھی ڈھکنا ہے۔ ایک تمہیں گھر بھر کی اولاد نہیں ہو۔ علیم نے ہار مان لی۔ اس نے اب تک پائجامہ نہیں پہنا تھا۔ اس لئے اس نے پائجامہ پہننا پسند کیا۔ قمیص کی جگہ اس نے گلے میں ایک تعویذ باندھ رکھا تھا۔

علیم نے ابا کی انگلی پکڑ کے کہا "قومی پتنگ لیں گے ابا!"

"ارے وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"وہ دکان پر ہے، چلئے دکھائیں آپ کو"

دکان پر کاغذی ترنگے کا پتنگ بنا ہوا تھا۔ تین آنے میں ملتا تھا۔ بہت سے پتنگ تھے۔ کریما نے اگلی جمعرات کے وعدے پر علیم کو پتنگ لے دیا۔ علیم ناچتا، کودتا، پتنگ جھم جھماتا ہوا چلا گیا۔

دکان والے جمن چاچا نے کہا: "آج آزادی کا دن ہے۔ قومی پتنگ بہت اڑ رہے ہیں"

کریما نے مری ہوئی آواز میں کہا: "بھائی پچھلے سال بھی یہی دن آیا تھا۔ مسلمانوں کو پاکستان ملا۔ ہندوؤں کو ہندستان ملا۔ جب کتنی خوشی تھی۔"

جمن نے منہ لٹکایا بولا: "ہم سوچتے تھے، اب کچھ ہوگا مگر بھیا کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ بس خالی قومی پتنگ اڑتے ہیں۔ ان کی بکری آج اچھی ہو رہی ہے"
جمن اتنا کہہ کے دو ایک گاہکوں کو مال دینے لگا۔

کریما، جمن کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ بولا: "خالی خولی قومی پتنگ اڑتے ہیں۔ مگر ڈھنڈ وہی ہے۔ مانجھا بھی وہی ہے۔ میرے یار نے کوٹھڑی میں قلعی بھی نہیں کرائی پچیس برس سے۔ ہاں کرایہ بڑھا دیا ہے۔ آزادی کے بعد سے"

جمن بولا: "ایک کرائے کو روتے ہو، یاں ہر چیز کے دام چوگنے، پانچ گنے، دس گنے ہوتے جا رہے ہیں"

کریما بولا: "میں سوچتا تھا آزادی ملی ہے۔ میں سرکار سے اپنی بیٹی کے بیاہ کے لئے روپیہ قرضے میں لوں گا۔ نئی کھولی میں رہوں گا۔ ایک نیا کرگھا خریدوں گا۔ اور بیوی بچوں کے لئے کپڑے سلاؤں گا۔ آج تو حکیم جی کی دوا کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ اور آج سویرے میں دلدار ہوٹل میں گیا۔ کہ اس کے مالک سے، اپنا مہربان ہے نا وہ، کچھ روپے لے آؤں مگر وہ کم بخت صاف انکار کر گیا۔ اُدھر دلدار ہوٹل میں ریڈیو پر کوئی بول رہا تھا۔ کہ آج آزادی کے دن سب لوگ چرخہ کاتیں۔ سوت کی انٹی تیار کریں۔ ادھر پچیس سال سے اپنا یہی دھندا ہے۔ تو کیا ہونا ہے اس سے۔ ہیں جی؟"

کریما یونہی بڑبڑا رہا تھا۔ کہ علیم بھاگتا ہوا آیا۔ بولا: "فیروزہ بلاتی ہے"۔ کریما دکان سے نکل کے اپنے گھر چلا گیا۔

فیروزہ کہنے لگی: "سیٹھ کی بیوی نے روپے نہیں دیئے۔ میں لوٹ آئی۔ سیڑھی پر سیٹھ یاسین بھائی کھڑے تھے۔ بولے: "فیروزہ کیسے آئی؟" میں نے کہا: "روپے لینے آئی تھی"۔ بولے: "کتنے روپے چاہئیں"۔ میں نے کہا: "دو"۔ بولے: "یہ دس کا نوٹ لے لو"۔ میں نے لے لیا۔ وہ مجھے کھینچ کر غسلخانے میں لے جانے لگے۔ میں چیخنے لگی۔ بڑی بیوی باہر نکل آئیں۔ انھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں بھاگ کے چلی آئی"۔

اتنا کہنے کے بعد فیروزہ نے دس کا نوٹ زمین پر پھینک دیا۔ اور اپنی پھٹی ہوئی اوڑھنی میں منہ چھپا کے رونے لگی۔

فیروزہ دیر تک روتی رہی، دیر تک کریما مسجد کے منارے کی

طرف دیکھتا رہا۔ دیر تک ان قومی پتنگوں کی طرف دیکھتا رہا جو اوپر ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ پھر سیٹھ یاسین بھائی کی موٹر کے گزرنے کی آواز آئی۔ وہی بھونپو تھا۔ کریما نے مڑ کے دیکھا۔ سیٹھ کا ڈرائیور اسے بلا رہا ہے۔ کریما تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑے ہوئے موٹر کی جانب بڑھا۔

گاڑی میں سیٹھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے "کریما! پہلی سے کوٹھری خالی کر دو"

کریما نے کانپتے کانپتے کہا "بہت اچھا سیٹھ"

سیٹھ کی گاڑی چلی گئی۔ جس کے آگے ترنگا لہرا رہا تھا۔ جس پر کبھی سبز ہلالی نشان کا جھنڈا ہوتا تھا۔ گاڑی چلی گئی۔ اور سیٹھ کو بھی لے گئی۔ جنھوں نے کھدر کا اچکن اور کھدر کا چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کبھی جناح کیپ ہوتی تھی۔ آج کھدر کی ٹوپی تھی۔ گاڑی چلی گئی۔ اور جاتے جاتے غریب جلاہے کی کھولی بھی لے گئی۔ بڈھا کریما رونے لگا۔ وہ اب کہاں جائے گا۔ علیم اپنے ابا کو آنسو پونچھتے دیکھ کر ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آیا۔ بولا۔

"ابا ہم سے یہ پتنگ نہیں اڑتا ہے۔ اسے اڑا دو"

جلاہے نے غصے میں آ کے علیم کے ایک پتھر مارا۔ اور غصے میں بھرا ہوا بازار کی طرف چلا گیا۔ جہاں دلدار ہوٹل تھا۔ اور جہاں ریڈیو بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

چرخہ چلاؤ۔ سوت کاتو۔ آزادی کا مبارک دن آج ہے

پندرہ اگست۔ ۱۹۴۸

راجن بابو کانگرس کے سبھاپتی کا بیان ... ...

... ... تاج میں اور گرین میں اور دوسرے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہزاروں چرخے چل رہے تھے، اور خوب صورت عورتیں بیش قیمت لباس پہنے ہوئے چرخہ چلا رہی تھیں، اور مرد سوت کی انٹیاں تیار کر رہے تھے۔ میرین ڈرائیو پر بمبئی کے سارے لکھ پتی تاجر جمع تھے، اور سمندر کے کنارے آلتی پالتی بیٹھ کر چرخے گھما رہے تھے۔ اور رام دھن گا رہے تھے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے دن ۔۔۔ ...

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے روز دوسرے اخبار کی سرخی یہ تھی۔

کشمیر میں پاکستانی فوجوں کو پسپا کر دیا گیا

ہندوستانی فوجیں موضع ہنڈر پر قابض ہو گئیں

کشمیر آزاد رہے گا

شیخ عبداللہ کا اعلان کشمیری عوام کے دلوں میں اس طرح ... ...

... ...

... ... موضع ہنڈر میں دو نالے بہتے ہیں۔ ایک تو ہنڈر کا نالہ ہے۔ دوسرا اوپر پہاڑوں سے بہتا ہوا آتا ہے۔ یہ دھڑے کا نالہ ہے۔ کیونکہ یہ پہاڑوں کی اونچی گھاٹیوں پر آباد چھوٹے سے قصبے دھڑے کے قریب سے ہو کے گزرتا ہے۔ جہاں پر یہ دونوں نالے ملتے ہیں۔ وہاں ایک اونچا سا ٹیلہ ہے جس کے ارد گرد کوئی پچاس کنال زمین ہوگی۔ اس ٹیلے پر بڈھے مشر کا گھر ہے، اور یہ

پچاس کنال زمین بھی اسی کی ہے۔ بڈھے رمشر کے تین جوان بیٹے ہیں۔ دو بہو ئیں، تین بیٹیاں اور چار چھوٹے لڑکے۔ اس کی بہو مر چکی ہے۔ جس کا اسے بہت غم ہے۔ وہ اکثر گھر کے باہر اخروٹ کے درخت کے تنے سے لگ کر نیچے بہتی ہوئی ہنڈر کی ندی کو تکا کرتا ہے۔ جہاں اس کی بیوی کے جسم کو جلا گیا تھا اسے وہ دن کبھی نہیں بھولتا، کبھی کبھی شام کو کھڑے کھڑے وہیں نالے کے پاس سے اسے اپنی بیوی کی چتا پھر سے روشن نظر آتی ہے۔ اور وہ گا تیری کا جاپ کرنے لگتا ہے۔

جب کشمیر کی لڑائی چھڑی۔ تو پہلے موضع ہنڈر پر پاکستان سے آئے ہوئے آزاد پٹھانوں نے قبضہ کر لیا۔ ہنڈر کے گرد و نواح میں سارے گاؤں مسلمانوں کے تھے۔ ہنڈر میں بھی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ چند گھر براہمنوں کے تھے۔ جو ہزاروں سال سے بستے چلے آرہے تھے۔ اور وہ براہمن ہی رہے تھے۔ اور کسی نے انھیں کچھ نہ کہا تھا۔ اور کسی نے ان کے مذہب کو بدل دینے کی کوشش تک نہ کی تھی۔ لوگ بڑی صلح و آشتی سے رہتے تھے لوگ صلح و آشتی سے رہتے تھے۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ لیکن حاکم لوگ نہیں۔ بڈھے رمشر کو راجہ ہردیو سنگھ جاگیردار کا زمانہ یاد تھا۔ جب ہر ایک سے بیگار لی جاتی تھی۔ جب گاؤں سے سارا غلہ چھین لیا جاتا تھا اور گاؤں کے مردوں کو کوڑے لگائے جاتے تھے۔ ہاں براہمنوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس رعایت کے عوض میں راجہ ہردیو سنگھ براہمن عورتوں سے وقتی عشق کرتا تھا۔ اسے رمشر کی بیوی گوماں پسند آگئی تھی، اور راجہ نے اسے گھر سے پکڑ

بلایا تھا۔ مشر کچھ نہ بول سکا تھا۔ راجہ کے ساتھ رات بسر کرنے کے بعد بھی گو ماں اُس کی بیوی رہی تھی۔ اور کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ کوئی کیا کہتا۔ راجہ صاحب نے کسی کی بیوی ہتیا لی۔ تو کسی کی بہو۔ یا کسی کی بہن۔ مضمون واحد تھا۔ کوئی بولتا تو کیسے۔

راجہ ہردیو سنگھ بہت برا جاگیردار تھا۔ رعایا اس سے پناہ مانگتی تھی۔ وہ مہاراجہ ہری سنگھ کا رشتے دار تھا۔ اس کے زمانے میں علاقے میں کئی بار بغاوت ہوئی اور کسانوں نے آزادی چاہی۔ لیکن ہر بار یہ بغاوت سختی سے دبا دی گئی۔ اور بغاوت کرنے والوں کے سر نیزوں پر لٹکا کر پھرائے گئے۔ اور ان کی زندہ کھال کھنچوا دی گئی۔

وہ زمانہ بہت برا تھا غلامی کا زمانہ تھا۔ ۱۵ اگست کے بعد آزادی آئی۔ اور موضع ہنڈر پر آزادی کے شیدائیوں نے قبضہ کر لیا۔ انھوں نے نہ صرف قصبے پر قبضہ کیا۔ بلکہ اس کے کل باشندوں اور ان کی کل املاک پر، تمام خوبصورت عورتیں چن چن کے آزاد کی گئیں۔ اور بہت سی علاقے سے باہر بھیج دی گئیں۔ مشر کی بہنیں اور بیٹیاں کوہاٹ سے پرے پہنچ گئیں۔ اس کے چھوٹے بیٹے مسلمان ہو گئے اور بڑے بیٹے جنگلوں سے ہوتے ہوئے راجوری بھاگ گئے۔ اور رجوری سے ہوتے ہوئے جموں پہنچ گئے۔ اور یہاں وہ فوج میں بھرتی ہوئے کیونکہ ان کے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ صرف بڈھا مشر اپنے گھر کے باہر اخروٹ کے درخت کے تنے سے لگا کھڑا رہا۔ اور نیچے بہتی ہوئی ہنڈر ندی کے بہاؤ کو تکتا رہا۔ جہاں اُسے اپنی بیوی کی جلتی ہوئی چتا نظر آتی تھی۔ حملہ آوروں نے مشر کو نہیں مارا۔ اُسے پاگل جان

کر چھوڑ دیا۔

جب ہندستانی فوج بڑھتی بڑھتی موضع بھنڈر کے قریب آگئی۔ تو حملہ آوروں نے ندی کے اُس پار مورچے باندھ لئے۔ اِس پار ہندستانی فوج کا مورچہ تھا۔ اس پار پاکستانی فوج کا۔ یہ دونوں فوجیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ سے پہلے ایک فوج کہلاتی تھیں۔ اور ان کی معرکہ آرائیوں نے گزشتہ جنگ عظیم میں دھوم مچا دی تھی۔ اب آزادی آگئی تھی۔ اس لئے اب ایک فوج دو فوجوں میں بٹ گئی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کے آمنے سامنے مورچے باندھ لئے۔ بیچ میں مشر کا گھر تھا۔ ایک اونچے ٹیلے پر جس کے چاروں طرف بھنڈر کی ندی اور دھڑے کی کسی بہتی تھی۔ دونوں فوجیں اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے جی جان کی بازی لگا رہی تھیں۔ اگن گولے دونوں طرف سے آتے۔ اور ٹیلے کی جھاڑیوں۔ درختوں کو جھلستے ہوئے آگے نکل جاتے۔ ہندستانی توپ خانے کا ایک گولہ گھر پر آن گرا۔ اور بڈھے مشر نے اپنے پہلے خوبصورت گھر کی دیواروں کو اکھڑ کر گرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے گھر کی دیواریں گریں۔ ساتھ ہی چھت۔ پھر کچھ نہ رہا۔ چاروں طرف دھول سی اڑی۔ اور گرم گرم خاک مشر کے نتھنوں کو جھلساتی گئی۔

دو دن کی گولہ باری کے بعد ہندستانی فوج نے اس ٹیلے پر قبضہ کر لیا۔ قبضہ کرنے والوں میں مشر کا اپنا بیٹا کانشی بھی تھا۔

مشر اخروٹ کے درخت کے پاس کھڑا تھا۔ کانشی بندوق اٹھائے اس کے پاس آیا۔ بولا: "چاچا۔ چاچا ... ..."

مشر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔
"چاچا۔ مجھے نہیں پہچانتے ہو۔ اپنے بیٹے کانشی کو ... ؟"
مشر نے کہا "تم یہاں کیا کرنے آئے ہو"
"میں موضع ہنڈر کو آزاد کرانے آیا ہوں۔ چاچا"
مشر نے کہا "پہلے وہ پاکستان کے پٹھان آئے تھے۔ وہ ہمیں آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک دن میں میرے گھر کی بہوئیں غائب ہو گئیں اب تم آئے اور آج ہی میرا گھر جلا۔ تم بھی ہماری آزادی چاہتے ہو۔ وہ بھی چاہتے ہیں۔ تم دونوں ایک ہی بات چاہتے ہو۔ پھر لڑائی کیوں ہے"
کانشی بولا "چاچا۔ آزادی ..."
مشر کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں ایک عجیب سا وحشیانہ پن آ گیا۔ بولا "کون آزادی چاہتا ہے۔ کون ہے وہ بدمعاش ... ..."

"چاچا ... چاچا ..."
"میری آزادی لے لو۔ مجھے میرے کھیت واپس کر دو۔ میری بہوئیں کوہاٹ سے منگا دو۔ میری لڑکیاں مجھے لوٹا دو۔ میرے گھر کی دیواریں مجھے بخش دو ..."
یکایک مشر نے کانشی کا ہات زور سے پکڑ لیا اور بولا "وہ دیکھو وہ دیکھو۔ ندی کے کنارے چتا جل رہی ہے۔ ایک چتا نہیں ہے۔ دو چتائیں ہیں ... ہندستان کی چتا۔ پاکستان کی چتا ... وہ سرخ سرخ شعلے

دیکھ رہے ہو تم - ایک ہوائی جہاز قصبے پر پمفلٹ برساتا ہوا گزر گیا۔ کاغذ کا ایک پرزہ اخروٹ کی شاخوں سے پھسلتا ہوا منشر کے پاؤں پر جا گرا - اس پر لکھا تھا۔

کشمیر میں آزادی کا جشن

سری نگر میں پنڈت نہرو کی آمد

شاندار سواگت، سارا شہر دلہن کی طرح

سجا ہوا اور ... ...

۱۵ اگست ۱۹۴۸ کو ایک اخبار کی سرخی یہ تھی ۔

پاکستان اسلامی ریاست ہے

روزہ نہ رکھنے والوں کے درے لگائے جائیں گے

موچی گیٹ کے باہر برادران اسلام کا عظیم الشان مظاہرہ جس میں مساوات اور اخوت ... ...

... ...

... ... حنیف لدھیانے ضلع کے ایک گاؤں چھینبہ کا رہنے والا تھا۔ حنیف تیلی تھا۔ اس کا باپ بھی تیلی تھا۔ اور وہ کئی سو سال سے اسی گاؤں میں تیلیوں کا کام کرتا چلا آ رہا تھا۔ یہ گاؤں سکھوں کا تھا۔ مسلمانوں کے گھر ہی کوئی دس بارہ ہوں گے ۔ پیجا لوہار۔ محمد و جلاہا اور ہاشم کمہار۔ اور آٹھ دس کمینوں کے گھر ہوں گے ۔ اور بس ایک پیر جی کا تکیہ تھا اور ایک چھوٹی سی مسجد، اور جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بعد فساد شروع ہوا۔ تو نہ وہ تکیہ رہا۔ نہ یہ مسجد۔ نہ ان کمینوں

سے گھر رہے۔ نہ ان جلاہوں، کمہاروں اور تیلیوں کے روزگار۔ شروع شروع میں تو گاؤں کے سکھوں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور ان گنے چنے مسلمان گھروں کی حفاظت کی۔ لیکن جب دوسرے گاؤں کے سکھ آ کے انھیں ملعون کرنے لگے۔ اور بندوقیں لے لے کے چڑھ دوڑے تو گاؤں والوں کو خطرہ لاحق ہوا۔ چنانچہ انھوں نے مسلمان گھروں پر سے دست شفقت اٹھا لیا اور انھیں گاؤں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ سکھ عورتیں اپنی مسلمان سہیلیوں سے گلے مل مل کے روئیں اور گاؤں کی چودھری تک اُن سے ملنے کے لئے آئیں۔ چند سکھ ان مسلمان خاندانوں کے ساتھ ہو لئے تاکہ انھیں باحفاظت تمام لدھیانے پہنچا دیں۔

راستے میں کوٹ گاؤں کے سکھوں نے اس قافلے پر حملہ کیا حفاظت کرنے والوں نے یونہی سا مقابلہ بھی کیا۔ لیکن آخر وہ بھی کہاں تک کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی افراد میں سے صرف چودہ افراد لدھیانے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکے۔ بچے مار ڈالے گئے۔ بڈھی عورتیں ختم کر دی گئیں۔ بڈھے اور ادھیڑ عمر کے بزرگ بھی چل بسے، اور نوجوان اور جوان عورتیں حملہ آوروں میں مال غنیمت کے ساتھ تقسیم کر دی گئیں اور جب حنیف اپنی بیوی بلقیس کو لے کے لاہور پہنچا۔ تو چودہ میں صرف تین آدمی رہ گئے ایک حنیف، ایک بلقیس، ایک آزاد پاکستان! سامنے کیمپ تھا۔ حنیف کیمپ میں پہنچا۔ جہاں ہزاروں آزاد مسلمان اپنی قابل رشک آزادی حاصل کر کے خوشی سے جمع ہو رہے تھے، ان کے قدموں تلے زمین تھی۔ سر پر کھلا

آسمان تھا ۔ اور چاروں طرف کمپ کے لوہے کی باڑھ تھی ۔ رضاکار ہر نئے آنے والے سے بڑی ملاطفت سے پیش آتے تھے اور اُسے مجاہد کا خطاب دیتے اور اُسے اس کے کیمپ کے سیکشن میں لے جاتے ۔ حنیف اور اس کی بیوی بلقیس کو " ۲۰ " سیکشن میں رکھا گیا ۔

" ۲۰ " سیکشن میں لدھیانے کے بہت سارے مہاجر جمع تھے ۔ ہر شخص کیمپ کے انتظام سے ناخوش تھا ۔ آزادی پا کر ملول اور رنجیدہ اور کبیدہ خاطر نظر آتا تھا ۔ دن بھر لڑائی دنگا ہوتا رہتا ۔ کئی بار تو مہاجرین میں آپس میں چل جاتی ۔ لدھیانے کے مہاجرین جالندھر والوں سے اور جالندھر کے مہاجرین امرتسر والوں کو کوسنے دینے لگتے ۔

" ۲۰ " سیکشن میں چند رضاکار پہنچے ۔ بولے " آپ لوگوں کے لئے ماڈل ٹاؤن میں بندوبست کیا ہے ۔"

" ماڈل ٹاؤن میں ! " آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں ۔

" جی ہاں ۔ مگر پہلے آپ لوگوں کا اسباب جائے گا ۔ اور بچے اور عورتیں دوسرے ٹرپ میں آپ لوگ "

" ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ پہلے بچے اور عورتیں بعد میں ہم لوگ ... ماڈل ٹاؤن ، بات ہوئی نا ! "

پہلے ٹرپ میں بلقیس گئی ۔ سکینہ بی اے گئی ۔ الماس گئی ۔ روشن آرا گئی ۔ اور بہت سارا اسباب گیا اور پھر لاری واپس نہیں آئی "

شام کے وقت ڈھونڈا گیا ۔ رات بھر ڈھونڈا گیا ۔ دوسرے روز ، تیسرے

روز، وہ رضاکار کہیں نہیں ملے۔ مہاجرین سخت طیش میں آ گئے، اور کیمپ کے باہر پولس اور ملٹری پر پتھراؤ کرنے لگے۔ آخو گولی چلی۔ دو تین مہاجرین سخت زخمی ہوئے۔ لیکن حنیف جان سے مارا گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۸ کو بلقیس لائل پور کے ایک جانگلی مسلمان سردار کے ہاں تھی جو ایم ایل اے بھی تھا اور اپنے علاقے کا سب سے بڑا جاگیردار جاگیردار نے بلقیس کو ساڑھے سات سو روپوں میں اس نقلی رضاکار سے خریدا تھا۔ وہ رضاکار اس کے اپنے غنڈے تھے۔ بلقیس اس وقت جام بھر بھر کے اسے پلا رہی تھی۔ اور کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا۔ اور مسلن کہہ رہا تھا۔

پاکستان اسلامی ریاست ہے
روزہ نہ رکھنے والوں کے درّے لگائے جائینگے

بڑے چوک میں راجہ غضنفر علی خاں نے تقریر فرمائی۔ جس میں انھوں نے مہاجرین کو بسانے کی اسکیم پر ... ...

... ...

... ... ۱۵ اگست ۱۹۴۸ کو پاکستان میں آنے والے سارے مہاجرین بسا دیئے گئے۔ کراچی، لاہور، راولپنڈی، گوجرانوالہ، وزیرآباد قصور۔ پاکستان کے کسی شہر میں اب کوئی مہاجرین کا کیمپ نہیں ہے۔ سب لوگ گھروں میں آباد کر دیئے گئے ہیں۔ زمینیں مہاجرین میں بانٹ دی گئی ہیں۔ جس جاگیردار کے پاس پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین ہے۔

اس سے زمین چھین کر غریب کسانوں اور مہاجرین میں بانٹ دی گئی ہے
کھانڈ کی ملوں، کپڑے کی ملوں۔ تیل کے کارخانوں، چھاپہ خانوں اور دوسرے
صنعتی اداروں کو پاکستان کے مسلمان مزدوروں کی تحویل میں دے دیا گیا ہے
تاکہ وہ بددیانت سرمایہ داری کا خاتمہ کر سکیں۔ کہ جس کا اسلامی شعائر سے کوئی
دور کا بھی واسطہ نہیں۔

۱۵/اگست ۱۹۴۸ کو چوتھے اخبار کی سرخی یوں تھی۔
درخت اگاؤ
آزادی کے دن درخت اگاؤ

آزادی کی سالگرہ پر مدھیہ پرانت کے منتری شری یت ... ...
سکریٹریٹ کے سامنے پیڑ لگائیں گے۔ اس موقع پر شہر کے سارے رؤسا اور
شرفا ... ...

... ... سیٹھ سونگٹ کے باغیچے کا مالی ایک آنکھ سے کانا تھا لیکن بڑا ہوشیار
تھا۔ باغیچے کو اس نے ایسی کاریگری سے سجایا تھا کہ ایک بار تو اگر ہینگنگ گارڈن
کے مالی بھی اسے دیکھیں تو اس کے ہاتھ چوم لیں۔ مالی کاریگر تو بہت اچھا
تھا۔ مگر مزاج اس کا بہت تیز تھا اور باتیں بے حد تلخ۔ اور اپنے ہاں تو کہا جاتا
کہ جو آدمی انگ ہین ہو۔ یعنی جس کے جسم کے کسی ایک حصے میں کوئی
نقص ہو۔ وہ شخص قطعاً اعتبار کرنے کے لائق نہیں ہے۔ مالی کے متعلق اتنا
تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تھا بہت ہی چالاک،

پر فن اور کایاں ۔ مشاق قسم کا آدمی ۔ سیٹھ سونگٹا خود بہت چالاک تھے، اسٹاک ایکسچینج پر سونے کے بھاؤ کے مشہور کھلاڑی تھے ۔ اور اکثر اپنے مقابلے پر آنے والوں کو ہمیشہ زک دیتے ۔ مگر اپنے مالی سے وہ بھی دبتے تھے ۔ کئی بار اسے ملازمت سے الگ کر دینے کی دھمکی دے چکے تھے ۔ مگر پھر بھی اس کی کڑوی راست بازی سے مرعوب ہو کے چپ ہو جاتے ۔

مالی باغیچے میں اس وقت گلاب کے ایک پودے کی نلائی کر رہا تھا ۔ پودے کی چوٹی پر گلاب کی ایک منہ بند کلی تھی، پتوں میں لپٹی ہوئی ۔ شرمائی شرمائی سی، نازک کنواری کلی ۔

سیٹھ کے دھوبی کی مالی سے گہری چھنتی تھی ۔ اس وقت دھوبی آ کے کہنے لگا ۔

" بھئی آج آزادی کا دن ہے "

" تو پھر کیا کروں ؟ " ۔ مالی بولا

" سیٹھ کہہ رہے تھے " ۔ دھوبی بولا " وہ ابھی سیکریٹریٹ جا رہے ہیں ۔ جہاں منتری جی پیڑ لگائیں گے "

" تو پھر کیا کروں " ۔ مالی بولا

دھوبی نے کہا " اور یہ بھی کہہ رہے تھے ۔ کہ آج چار سو پیڑ لگائے جائیں گے ۔ جن پر بیس ہزار روپیہ خرچ ہو گا "

مالی بولا " مجھے بیس ہزار روپے دیں ۔ میں چار سو کیا کم از کم دس ہزار درخت لگائے دیتا ہوں ۔ مگر یہ تو کسی نے ٹھیکہ لیا ہو گا میرے یار نے "

"ارے نہیں جی "۔ مالی بولا "تمھیں تو ہر وقت الٹی سوجھتی ہے اور سیٹھ یہ بھی کہہ رہے تھے۔ کہ آج ہر ہندستانی کو ایک پیڑ لگانا چاہئے"

مالی بولا "میری تو زندگی پیڑوں کے لگانے اور اگانے میں گزر گئی۔ پھر بھی تو اپنی زندگی میں کبھی رونق نہیں آئی۔ اور پھر بھیا پیڑ لگا کے کوئی کیا کرے۔ پیڑ لگائے کوئی اور پھل کھائے کوئی۔ اب دیکھو۔ میں اس باغیچے کا مالی ہوں۔ اس باغیچے کی ساری رونق اپنے دم سے ہے۔ یہ روش، یہ پھول۔ یہ پھل۔ یہ پتیاں۔ ان کی ساری بہار اپنے سے ہے لیکن یہ بہار اپنے لئے نہیں ہے۔ اپنے لئے تو بس جب سے پیدا ہوئے خزاں آگئی۔ میں پھول کھلاتا ہوں، وہ پھول سٹھانی کے جوڑے میں مہکتے ہیں۔ اور میری مالن باسی پھول اڑستی ہے۔ میں آم کی قلم لگاتا ہوں۔ اور آموں کے ٹوکرے برف خانوں میں ٹھنڈے ہو کے سیٹھ کے دسترخوان پر پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اب تم کہتے ہو درخت لگانے کو، میں عمر بھر سے یہی کام کرتا آیا ہوں۔ مگر میں پوچھتا ہوں۔ اس سے میری حالت تو نہیں بدلی میں کب تک دوسروں کے لئے درخت اگاتا رہوں گا۔ تم کب تک دوسروں کے لئے کپڑے دھوتے رہو گے؟"

"میرے یار تم تو سنکی ہو" دھوبی نے مالی کی پیٹھ پر ہاتھ مار کے کہا "چلو، آج آزادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ آج تو جیسا ہمارے بڑے نیتا کہتے ہیں ویسا کریں۔ وہ دیکھو۔ وہاں جگہ ننگی بھی دکھائی دیتی ہے، وہاں پیڑ لگاؤ۔ لال بجری کی سڑک کے کنارے جس کے قریب سے سیٹھ

موٹر گزرتی ہے نا "

مالی نے غور سے اس جگہ کی طرف دیکھا۔ پھر سر ہلا کے کہنے لگا۔
" بات تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ آؤ۔ یہ آم کا پیڑ لگا دیں گے وہاں "

دونوں دوست لال بجری والی سڑک پار کرکے بغیچے کے دوسری طرف چلے گئے۔ اور چھوٹا سا گڑھا کھود کے انھوں نے آم کے اس نازک سے پودے کو وہاں لگا دیا۔ آم کے نئے نئے پتوں کی ہریالی میں ہلکی ہلکی اداہٹ تھی۔ اور ان سے بڑی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔

مالی نے کہا " اس پیڑ کے آم بہت اچھے ہوں گے۔ میٹھے رسدار الفانسو کو شرمانے والے۔ میں اچھی طرح ..."

مالی آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ سیٹھ سونگسٹا کی تیز موٹر شور مچاتی ہوئی قریب سے نکل گئی۔ اور مالی اور دھوبی چونک کر اور ایک دم اچھل کر اپنے آپ کو بچاتے ہوئے رستے سے دور جا کھڑے ہوئے۔ موٹر بالکل قریب سے موڑ کاٹتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اور آم کے نئے پودے کو اپنے ٹائر سے کچل کر ٹکڑے ٹکڑے کر گئی۔

× × ×

اور پندرہ اگست کی رات کو مالی نے ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا اس نے دیکھا کہ غلے کے انبار آسمان تک اونچے چلے گئے ہیں۔ اور کروڑوں آدمی ان کے گرد جمع ہو رہے ہیں۔ اور جونہی وہ لوگ غلے کو اٹھانے کے

لئے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اُن انباروں کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور انباروں کو اپنی اوٹ میں لے لیتے ہیں اور یہ درخت اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے کھڑے ہیں۔ کہ کوئی غلے کا ایک دانہ بھی نہیں لے جا سکتا۔

پھر اس نے دیکھا۔ کہ ہزاروں سیڑھیوں کے اوپر بڑی بڑی عالیشان ملیں ہیں۔ جو شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ جن کے اندر لاکھوں چرخیاں چل رہی ہیں۔ اور کپڑا بن رہی ہیں۔ اور یہ کپڑا لاکھوں کروڑوں اربوں گز تیار ہو کے اوپر آسمان کی طرف بادل بن کے اڑا جا رہا ہے۔ اور سیڑھیوں پر لاکھوں آدمی ننگے پڑے ہیں۔ اور گھسٹ گھسٹ کر اوپر چڑھ رہے ہیں۔ اور کپڑے کے لئے چیخ رہے ہیں۔ اور جونہی یہ لوگ بڑی مشکل سے سیڑھیاں چڑھ کے دروازوں تک پہنچے ہیں۔ کہ چاروں طرف اونچے اونچے درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ لگے لگے اور ان کی اوٹ میں وہ ملیں اور کارخانے چھپ جاتے ہیں۔ اور لوگ سیڑھیوں پر نڈھال ہو کے گر پڑتے ہیں۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا باغ ہے۔ میلوں تک پھیلا ہوا اور اس میں ایک بہت بڑا محل ہے۔ ایکڑوں کے رقبے میں پھیلا ہوا۔ اور اس محل کے عالیشان دروازے کے باہر بلند و بالا ستونوں کے پاس ایک دبلا پتلا آدمی کھڑا ہے۔ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے۔ اور اس کے سامنے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہے۔ جو مرد ہیں ان کے سر کٹے ہوئے ہیں جو عورتیں ہیں ان کے پستان، اور یہ مجمع لاکھوں زبانوں سے پوچھتا ہے،

"اس میلوں تک پھیلے ہوئے باغ اور اس کے اندر اس عالی شان محل میں کون رہتا ہے"

"میں رہتا ہوں"

"تم کون ہو"

"میں ہندستان کا سب سے بڑا افسر ہوں، تم کون ہو"

ہم ہندستان ہیں۔ لاکھوں زبانیں۔ سرخ سرخ پتلی زبانیں بسنے لگتی ہیں۔ بھوکا ننگا پیاسا ہندستان۔ ہم اس محل کے اندر آنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی زمین نہیں ہے۔ کوئی روزی کی سبیل نہیں ہے۔

سیاہ چشمہ پہنے ہوئے وہ دبلا پتلا آدمی بڑے، جیسے سردوں میں تیری آواز میں کہتا ہے "ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ مجھے تاج برطانیہ سے پوچھنا ہوگا تم نہیں جانتے کہ دستوری حکومت کے مطابق ... ...

لیکن لوگ چلا کر کہتے ہیں "دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو"

وہ دبلا پتلا آدمی اندر چلا جاتا ہے۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ پھر بھی نہیں کھلتا۔ اور لوگ ہزاروں لاکھوں لوگ چاروں طرف سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں کھلتا ... ...

اور پھر مالی نے دیکھا کہ جیسے یہ منظر آن ناحد میں غائب ہوا اور اس کی جگہ ایک عالیشان کورٹ کے گنبد پر سبز رنگ کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اور

کورٹ کے چاروں طرف دراز قد بلوچی سپاہی کھڑے ہیں۔ لیکن جیسے وہ پتھر کے بت سے بنے ہیں۔ اُن میں سے کوئی حرکت نہیں کرتا۔ درحالیکہ اس وقت چاروں طرف سے سربریدہ مرد آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ہزاروں عورتیں اپنے زخمی جسموں کو اپنے بالوں میں چھپائے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان عورتوں کے بالوں میں تیل کے کڑاہے ابل رہے ہیں۔ جن میں ان کے بچے تلے جارہے ہیں۔ اپنے سر اپنے ہاتھوں میں لئے ہیں اور ان کی آنکھوں سے خون جاری ہے۔ اور عورتوں کی آنکھوں سے دودھ کے آنسو پھوٹ رہے ہیں۔ اور جہاں پر اس دودھ کی ایک بوند گرتی ہے۔ وہاں سے گوشت کے جلنے کی آواز سی پیدا ہو رہی ہے۔

اور یہ ہزاروں لاکھوں مرد اور عورتیں آگے بڑھتے ہوئے اُس کورٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ مکھیوں کے بھنبھنانے کا سا شور پیدا ہوتا ہے۔ اور بلند ہوتا جاتا ہے۔ اتنے میں کورٹ کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک خوش پوش انسان نمودار ہوتا ہے۔ اور اپنی میٹھی مہربان مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر لاکے پوچھتا ہے۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو"

"ہم اندر آنا چاہتے ہیں"

"تم اندر نہیں آسکتے"

"کیوں"

"یہ جگہ میری ہے"

"تم کون ہو"

"میں پاکستان کا سب سے بڑا افسر ہوں۔ اور تم کون ہو"

"ہم پاکستان ہیں۔ ہم مہاجرین ہیں۔ ہم لٹی ہوئی عصمتیں ہیں۔ ہم نیل میں بھنے ہوئے بچے ہیں۔ ہم زندگی کی فریاد ہیں۔ انسانیت کا زخم ہیں سرمایہ داری کا داغ ہیں۔ جاگیرداری کا ظلم ہیں۔ مذہب کی لاش ہیں۔ ہمیں اپنے کلیجے سے چمٹا لو۔ مرہم کی طرح ہمارے رستے ہوئے ناسوروں سے لگ جاؤ۔"

اسی میٹھی مہربان مسکراہٹ کے ساتھ انکار سے سر ہلاتے ہوئے وہ آدمی اندر چلا جاتا ہے۔ اور اندر سے دروازے سے جھانک کے کہتا ہے

"مجھے بہت افسوس ہے بھائیو۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا"

"اگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تو یہ کورٹ چھوڑ دو۔ اور ہم میں آ ملو"

لاکھوں آدمیوں کی گونج پیدا ہوتی ہے۔

"افسوس ہے کہ آپ لوگ جاہل ہیں۔ دستوری حکومت کے آداب جن سے گورنر جنرل پاکستان کا براہ راست تاج برطانیہ سے تعلق ہے ...

خوش پوش انسان اندر چلا جاتا ہے۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ پھر بھی نہیں کھلتا۔ اور لوگ ـــــ ہزاروں لاکھوں لوگ چاروں طرف سے آگے بڑھتے ہیں اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دروازہ پوری طرح بند نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں کھلتا ...

اور پھر مالی نے دیکھا کہ وہ سب کچھ نہیں ہے صرف ایک کار ہے
اور وہ دوڑ تک سے نئے لگے ہوئے پودوں کو روندتی جا رہی ہے۔ روندتی جا
رہی ہے۔ روندتی جا رہی ہے۔ مالی چیختا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ ایسا مت
کرو۔ ایسا مت کرو۔ یہ نئے پودے ہیں۔ ایسا مت کرو۔ وہ دوڑتا دوڑتا گر پڑتا
ہے۔ ایک پچھلے ہوئے پودے کے پاس۔ اور پھر وہ ہاتھ بڑھا کر اس پودے
کو اٹھا لیتا ہے۔ اور آن واحد میں وہ پودا اس کے ہاتھ میں ایک لہراتا ہوا سانپ
کا پھن بن جاتا ہے۔ اور وہ گھبرا کر اور چیخ مار کر اسے اپنے ہاتھ سے چھوڑ
دیتا ہے۔ اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

"کیا ہوا؟" مالی کی بیوی نے اس سے پوچھا

مالی بولا "وہ بڑا بھیانک اور عجیب خواب تھا"

وہ آنکھیں ملتا ہوا آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ
آزادی کی رات ختم ہو رہی ہے۔ اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے۔ وہ نلائی
کا سامان اٹھا کے باغیچے میں چلا گیا جہاں صبح اس نے گلاب کے پیڑ پر ایک
ننھی سی کلی کو پھوٹتے دیکھا تھا۔

یہ کلی اس وقت گلاب کا ایک ہنستا ہوا شگفتہ پھول بن گئی تھی، اور
اس کی نازک پتیوں پر شبنم کی بوندیں لرز رہی تھیں ؛